فسانہ
بہترین
کہانیاں

اپنے
حُسن
کو
چار چاند
لگائیے
ہمیشہ سوم پراڈکٹس پرائیویٹ لمیٹڈ کلکتہ کے
للی جیولری
گولڈ
پلیٹڈ
زیورات پہنیئے۔ یہ زیورات دلکشی میں کسی طرح بھی سونے کے زیورات سے کم نہیں۔ لیکن قیمت میں گھڑائی سے بھی کم ہیں۔ آپ کی سُندرتا کو نکھارنے کے لئے بہترین ہیں۔
تجارتی معلومات کیلئے: ایم۔ ایس۔ شرما اینڈ سنز ۲۴۰ پوسٹ آفس سٹریٹ صدر بازار دہلی ۶
GAYWAYS/SP/23

اشاعت کا پہلا سال
شرح چندہ
سالانہ ۵ روپئے
ایک کاپی ۶۵ نئے پیسے
فسانہ
رہنما
بلونت سنگھ
فسانہ میں شائع ہونے والے تمام
ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام مقام
واقعات اور ادارے قطعی فرضی
ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات
واقعات یا اداروں سے ان کی
کوئی مطابقت محض ایک اتفاق ہے
جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف
پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔
مدیر
مسعود احمد
خوشنویس :-
سید احمد حسین
آرٹ
نایاب
طابع و ناشر :- مسعود احمد
مطبوعہ :- اسرار کریمی پریس الہ آباد
ٹائیٹل :- بھارگو پریس الہ آباد
دفتر فسانہ ۲۱۶ - دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد ۳

ہر دس منٹ پر
فرحت اور تازگی کے لئے
چیتا فائٹ
بیڑی
پیجئے
H.L.M. BIRI WORKS
حاجی لعل محمد بیڑی ورکس میر گنج الہ آباد

اِس شمارے میں

زردے کے موجد
احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
چوک لکھنؤ
کا
تیار کردہ
زردہ
قوام
گولی
پان کی جان ہے
اسکی لذت شروع سے آخر تک یکساں قائم رہتی ہے
احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
ہیڈ آفس۔ چوک لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۳۱۷
کارخانہ۔ عبدالعزیز روڈ۔ لکھنؤ
فون نمبر ۲۵۹۵۸

اداریہ

"فسانہ" کا تازہ شمارہ پیش کرتے ہوئے ہم بڑی مسرت محسوس کر رہے ہیں۔ خدا کا کرم و فضل ہے کہ اردو پڑھنے والوں نے اس کے پچھلے شماروں کو پسند فرما کر ہماری کوششوں کو مشکور بنایا۔ ہم ہر بار یہی کوشش کرتے ہیں کہ رسالہ کے معیار کو بلند سے بلند تر بناتے رہیں۔

ہم کو اپنے ارادوں میں کتنی کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس کا صحیح فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔

رسالہ کی "مانگ" اور سیل کو ہم کوئی سند اور دلیل نہیں سمجھتے کیونکہ اصل سند تو "ارباب نظر" کی پسند ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ زیر نظر شمارہ بھی آپ کو اپنی توقعات سے زیادہ عمدہ اور معیاری نظر آئے۔

اس میں جن فنکاروں کی تخلیقات ہم پیش کر رہے ہیں وہ سبھی مشہور و معروف ہیں۔ جنہیں کسی تعارف کی قطعی ضرورت نہیں۔

قاضی عبدالستار، واجدہ تبسم، اور جمیلہ ہاشمی کی کہانیاں خاص طور پر پسند کی جائینگی۔

مدیر

قاضی عبدالستار

پیتل کا گھنٹہ
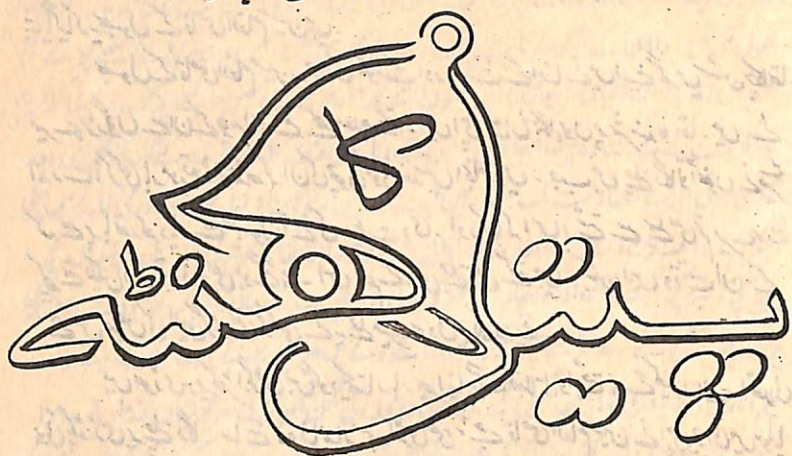
آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے۔ لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اُتر پڑا۔ کنڈکٹر سڑک کے کنارے ایک درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی سلگانے لگا۔ مسافروں کی نظریں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ میں بھی سڑک کے کنارے سوچتے ہوئے دوسرے پیڑ کی جڑ پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ ایک بار نگاہ اُٹھی تو سامنے دور درختوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے۔ میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھردرے دیہاتی ہاتھ نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لی۔ میں اس کے بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا۔ مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا۔

"یہ کون گاؤں ہے۔؟" میں نے میناروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"یو...... یو بھسول ہے۔"

بھسول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آگئی۔ میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا۔ وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور چوڑے پائینچے کا پاجامہ اور فرکی ٹوپی دیے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر ان کی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ اُنھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمتگار کے ہاتھ سے پھولوں کی بدھیاں لے لیں اور مجھے پہنانے لگے۔ میں نے بل کھا کر اپنی بنارسی پوت کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کر کے تلخی

سے کہا۔ "کیا یہ کافی نہیں تھی۔؟" وہ میری بات پی گئے۔ بدھیاں برابر کیں پھر میرے ننگے سر پہ ہاتھ پھیر اور مسکرا کر کہا۔ "اب تشریف لے جایئے۔" میں نے ڈیوڑھی کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بتایا گیا کہ یہ بھسول کے قاضی انعام حسین ہیں۔

بھسول کے قاضی انعام حسین۔ جن کی حکومت اور دولت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ میں اپنی گستاخ نگاہوں پر شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آکر کئی بار موقع ڈھونڈھ کر ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں انجام دیں۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے بھسول آنے کی دعوت دی۔ اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد بھی ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ جملے میرے دل پر لکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر کھڑا اکڑی "بس" کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنا بیگ جھلاتا ہوا جتے ہوئے کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی، جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکان کا سلسلہ تھا، جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہوں گے۔ ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اونچے آم کے درخت ٹرانک کے سپاہی کی طرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے، جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے وہاں اس وقت نہ کوئی آدمی تھا نہ آدم زاد کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے۔ لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈوریے کی قمیص، میلا پاجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے، ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ میرے قریب آئے اور جیسے یک دم کھل گئے۔ میرے ہاتھ سے میرا بیگ چھین لیا اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ڈیوڑھی میں گھس گئے۔

ہم اس چکّردار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی دھنیوں کو گھسے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی سے ہی چلّائے۔ "ارے سنتی ہو...... دیکھو تو کون آیا ہے..... میں نے کہا اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے۔" لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ دھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس۔ دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ سی کھڑی تھیں پھر انھوں نے لپک کر گھر کی الگنی پر پڑی مارکین کی گھر کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چکتا پیوند چھپ جائے۔

اس اہتمام کے بعد وہ میرے پاس آئیں کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سکھ اور دکھ کی گنگا جمنی آواز میں دعائیں دیں۔ دادی کانوں سے میری بات سن رہی تھیں۔ لیکن ہاتھوں سے جن کی جھریاں بھری کھال جھول گئی تھی۔ دالان کے اکلوتے ثابت پلنگ کو صاف کر رہی تھیں۔ جس پر میلے کپڑے، کتھے چونے کی کلھیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں، مجھے پلنگ پر بیٹھا کر دوسرے جھلنگا پلنگ کے نیچے سے وہ پنکھا اٹھا لائیں، جس کے چاروں طرف کالے کپڑے کے گوٹ لگی تھی اور کھڑی ہوئی میرے اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے چھین نہ لیا۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ وہ ایک تین دروں کا دالان تھا۔ بیچ میں مٹی کا چولہا بنا تھا۔ المونیم کی چند میلی پتیلیاں کچھ پیپے کچھ ڈبے کچھ شیشے بوتل اور دو چار اسی قسم کی چھوٹی موٹی چیزوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے چولہے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ دادا نے کونے میں کھڑے ہوئے پرانے حقّے سے بے رنگ چلم اتاری اور باورچی خانہ میں گھس گئے۔ میں ان دونوں کی گھن گھن کرتی سرگوشیاں سنتا رہا۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے، میں نے اپنی شیروانی اتاری اور ادھر ادھر دیکھ کر چھ دروازوں والے کمرے کے کواڑ پر ٹانگ دی۔ نقشین کواڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ ایک جگہ لوہے کی پتی لگی تھی۔ لیکن بیچوں بیچ گول دائرے میں ہاتھی دانت کا کام، کتھے اور تیل کے دھبوں میں جگمگا رہا تھا۔ بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے اور جب تک میں دوڑوں دوڑوں دادا گھڑونچی پر سے گھڑا اٹھا کر اس لمبے چوڑے کمرے میں رکھ آئے۔ جس میں ایک بھی کواڑ نہ تھا۔ صرف گھیرے لگے کھڑے تھے۔ جب میں نہانے گیا تو دادا المونیم کا لوٹا میرے ہاتھ میں پکڑا کر مجرم کی طرح بولے۔ "تم بیٹے اطمینان سے نہاؤ۔ اِدھر کوئی نہیں آئے گا۔ پردے تو میں ڈال دوں لیکن اندھیرا ہوتے ہی چمگادڑ گھس آئے گی۔ اور تم کو دق کرے گی۔

میں گھڑے کو ایک کونے میں اٹھائے گیا وہاں دیوار سے لگا، اچھی خاصی سینی کے برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنٹے میں موگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دو انگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسی بندھی تھی۔ اسی سوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا اس کے اوپر سات پہل کا ستارہ تھا۔ میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا بھسول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا۔ عربی رسم الخط میں "قاضی انعام حسین، آف بھسول اسٹیٹ اودھ" کھدا ہوا تھا۔ یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھنے کے لئے اٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے اٹھا نہ سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دیکھتا رہا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔ جب باہر نکلا تو آنگن میں قاضی انعام حسین پلنگ بچھا رہے تھے۔ قاضی انعام حسین جن کی گدی نشینی ہوئی تھی۔ جن کے لئے بندوقوں کا لائسنس

لینا ضروری نہیں تھا۔ جنہیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں پر خدمتگاروں کی طرح طباق اُٹھائے ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں "لب سوز" "لب بند" چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دو اُبلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیئے گئے تھے۔ شروع اکتوبر کی خوشگوار ہوا کے ریشمی جھونکوں میں ہم لوگ بیٹھے نمک پڑی ہوئی چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی بوڑھی آواز نے ہانک لگائی " مالک.....!"

"کون ــــ ؟"

" مہتر ہے آپ کا......... صاحب جی کا بلاوے آئے ہے ــ"

دادا نے گھبرا کر احتیاط سے اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے پہنتے ہوئے باہر چلے گئے اپنے بھلے دنوں میں تو اس طرح شاید وہ کمشنر کے آنے کی خبر سن کر بھی نہ نکلے ہوں گے۔

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر جب واپس آیا تو ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی تھی دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے۔ میں ڈیوڑھی سے ڈبیا اُٹھا لایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لے کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر لمبی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں ہم لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دادا میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات بتاتے رہے...... اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے۔ کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دسترخوان لگایا۔ بہت سی اَن میل بے جوڑ اصلی چینی کی پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چُنا۔ شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا۔

صبح میں دیر سے اُٹھا۔ یہاں سے وہاں تک پلنگ پر ناشتہ چُنا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا ہے۔ جب میں اپنا جوتا پہننے لگا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادی نے مجھے آنسو بھری آواز سے روکا۔ میں معافی مانگتا رہا۔ دادی خاموش کھڑی رہیں۔ جب میں شیروانی پہن چکا، دروازے پر یکّہ آ گیا، تب دادی نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھا۔ ان کے چہرے پر چونا پُتا ہوا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ " یہ اکاون روپے تمہاری مٹھائی کے ہیں اور دس کرائے کے......"

ارے...... ارے دادی ..... آپ کیا کر رہی ہیں !" اپنی جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو میں نے پکڑ لیے۔

چپ رہو تم...... تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں۔ جو جس کا حق ہوتا ہے، وہ دے تو دیتے ہیں...... غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چیٹ بھی نہ دے سکوں...... میں ...... بھیّا ...... تیری دادی تو فقیرن ہو گئی .... بھکارن ہو

گئی۔ بھکارن ہوگئی۔

معلوم نہیں کہاں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔ وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں، دادا میری طرف پشت کئے کھڑے تھے اور جلدی جلدی حقّہ پی رہے تھے۔ مجھے رخصت کرنے دادی ڈیوڑھی تک آئے لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔ میری پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔

دادا قاضی انعام حسین تعلقدار بھسول تھوڑی دیر تک میرے یکّہ کے ساتھ چلتے رہے، لیکن نہ مجھ سے نگاہ ملائی نہ مجھ سے خدا حافظ کہا۔ ایک بار نگاہ اُٹھا کر دیکھا اور میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دی۔

سدھولی جہاں سے سیتاپور کے لئے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکّہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکّہ والا ہاتھ جوڑے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا...... "میاں ..... الی شاہ جی بھسول کے ساہوکار ہیں۔ ان کے یکّہ کا بم ٹوٹ گوا ہے۔ آپ بُرا نہ مانو تو الی بیٹھ جائیں"

میری اجازت پا کر اُس نے شاہ جی کو آواز دی۔ شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکّے والے نے میرے اور ان کے سامنے پیتل کا گھنٹہ دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں مونگری کی چوٹ کا داغ بنا تھا۔ دوا نگل کے حاشیے پر سوراخ میں سوت کی رسّی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا ہوا تھا، میں اُسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور یکّے والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکّے والے سے رہا نہیں گیا، اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو ـــ ؟"

" ہاں ـــ کل شام کا معلوم نائی کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دیے دیہیں۔ بلائی کے.... ائی........"

"ہاں وقت وقت کی بات ہے۔ شاہ جی نائی تو ای گھنٹہ..... اے گھوڑے کی تم راستا دیکھ کے چل ... ،، یہ کہہ کر اُس چابک جھاڑا

میں میاں کا بُرا وقت۔ چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

(۱)
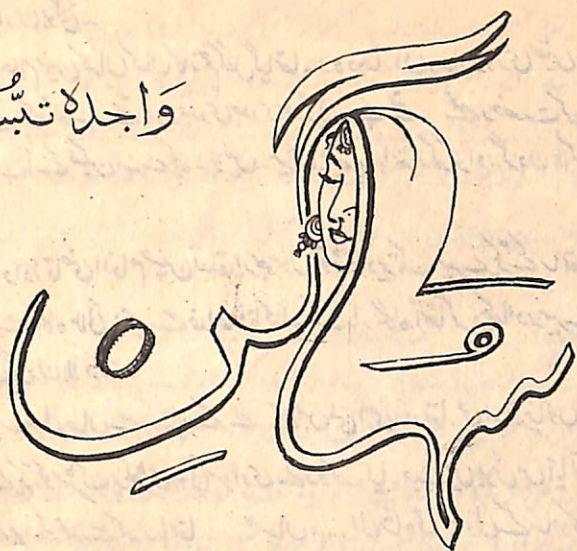
سلیمان میاں تو سدا کے بگڑیل تھے۔ اس میں ان کا اتنا اپنا قصور بھی نہ تھا جتنا کہ ماں باپ کا۔ اور باپ سے بڑھ کر ماں۔

اکلوتی اولاد تھے، جو بولتے ماں پورا کر دکھاتیں۔ جوانی آئی مگر ان کے چلن میں کوئی فرق نہ آیا۔ بس وہی کریں گے جو دل میں سمائے گی۔ ماں باپ نے چھوٹ ہی ایسی دے رکھی تھی ——

بھری برسات کے دن، نالے میں پانی اُچھل اُچھل کر کتھئی رنگ کا ہو گیا۔ بھرّاٹے دار ہوا اور جھراٹے کا بہاؤ۔ ایسے میں بھلا کوئی یوں تیرنے کو جایا کرتا ہے۔

باہر نکلنے لگے تو ماں نے پوچھا بھی۔ "کہاں جاتے ہو سلّو میاں۔؟"

بولے: "ایسے ہی ذرا گھوم کر آتا ہوں اماں۔"

"دوئی ایسے میں کہاں گھومنا ہے میاں۔؟ سارے میں پچپچاہٹ ہو رہی ہے۔ ایسے میں گھر میں بیٹھتے ہیں یا سیر سپاٹے کو جاتے ہیں۔؟"

"آپ تو چاہتی ہیں میں لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں بیٹھا رہا کروں۔ بھلا اس موسم میں تیرنے کا جو مزہ ہے وہ پھر کہاں۔؟" دھڑاک سے دروازہ کھول باہر نکل گئے۔

صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام اور پھر کالی گھور اندھیری رات ۔

رات کے سناٹے میں محلے والے سلو میاں کی لاش حفیظ میاں کے گھر پہنچا گئے ۔ "ہائے میرا لال!" حفیظ میاں دہاڑے۔ اندھیرے کو ٹٹولتی ہوئی ماں دروازے تک آئی تو دیکھا کھری چارپائی پر ڈھلی ڈھلائی لاش رکھی ہے۔ اور کچھ ان سے دیکھا نہ جاسکا، دھڑ سے چوکھٹ پر گر پڑیں۔

اختر بھائی کے بچّے کو گود میں لئے دودھ روٹی کا چورا کھلا رہی تھیں ۔ "راجہ کیا کھائے گا ۔ ؟"

"ہپّا ۔" منّا منہ پھاڑ کر بولا

"راجہ کیا پئے گا ۔ ؟"

"ممّا ۔"

"اور راجہ دولھا کیسے بنے گا بھئی ۔ ؟"

"ڈھم ۔ ڈھم ۔ ڈھما ۔" منّا دونوں ہاتھوں سے ہو ہو کے تالیاں پیٹنے لگا۔ اور اختر زور زور سے ہنسنے لگی۔

اک دم باہر سے عزیز میاں لپکے ہوئے آئے ۔ اُن کے ہاتھوں میں مسلا مسلایا پوسٹ کارڈ تھا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ اختر کو یوں بے تحاشا ہنستا دیکھ کر اُن کا منہ کھنچ گیا۔ اپنی ساری طاقت سمیٹ کر وہ بڑی مشکل سے پکارے :۔

"اجی کہاں ہو، ؟ سُنتی ہو !"

وہ بوکھلائے بوکھلائے اختر کی اماں کو آوازیں دینے لگے ۔

"جی ۔" عارفہ بیگم کھلا سر ڈھانپتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے نکل آئیں۔

"ذرا انڈے تلوا رہی تھی، ماما تو جلا کر راکھ کر دیتی ہے ۔ توبہ میری آپ بھی یوں چلّانے لگتے ہیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے موا ۔" اک دم ان کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر بولیں:

"کس کا کارڈ آیا ہے ۔ ؟"

عزیز میاں کہیں بہت دور سے بولے ۔ "سلیمان میاں کہیں تیرنے گئے تھے ۔"

اختر کے کان کھڑے ہو گئے ۔ عارفہ بیگم کا منہ ذرا ذرا کھل گیا ۔ میاں رُک گئے تو بیتابی سے بولیں:

"ہاں ہاں تو کیا ہوا پھر ۔ ؟"

"آدھی رات کو ان کی لاش گھر لائی گئی

"لاش۔؟" عارفہ بیگم نے سوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "لاش۔؟"، سفید آنچل اُن کے سر پہ پھڑپھڑ کرنے لگا۔ اختر کے ہاتھوں سے دودھ روٹی کا نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جاگرا۔
ایک دم عارفہ بیگم دوڑیں اور اختر سے لپٹ کر بین کرنے لگیں :۔
"ہائے میری بیٹی! ہائے میری دلاری! ابھی تیرے سہرے کے پھول کھلے بھی نہ تھے کہ بیوہ ہوگئی ہائے!"

ماں کے آنسوؤں سے اختر کا منہ دھل رہا تھا اور وہ سہم کر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ اس قدر بوڑھی ہوگئیں تھیں!

سلّو میاں خود تو قبر کی گود میں جا سوئے اور اختر کے نصیبوں کو روگ لگا گئے۔ اختر گیارہویں سال میں تھی۔ زمانہ ہوا سلّو میاں سے نسبت طے پا چکی تھی اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی گڑبڑ بج رہی تھی۔ چھوٹی سی دھان پان کی گڑیا، یوں تو گیارہ برس پورے ہونے کو آرہے تھے مگر ذرا بھی سمجھ نہ تھی۔ ساس کی یہی خوشی تھی کہ گڑیا ایسی بہو گھر میں چھم چھماتی چلے، ادھر ماں کہتی تھیں :۔ "کچھ نہیں تو بیٹیا کو ہرا دوپٹہ تو اُڑھا دوں۔"

اب لاکھ ننھی تھیں بی اختر، مگر یہ تو سمجھ تھی ہی کہ اپنی نسبت لگ چکی ہے۔ خالہ کے بیٹے سلّو میاں کبھی چھوٹی خالہ سے عید، بقرعید ملنے آتے تو اماں پچکارتیں :۔
دوئی لڑکی شرم ہے یا نہیں۔؟ اندر جاکر بیٹھ۔ کیا ہونے والے مرد سے دیدے لڑائے گی۔"
اندر جاکر بیٹھ تو جاتیں، مگر دروازے کی جھری سے آنکھ لگ جاتی۔ "کالی ٹوپی، ناسی رنگ کی اچکن، چست پاجامہ۔ ہائے کیا پیارے شہزادے سے لگ رہے ہیں۔ میں مرجاؤں! اماں نے ان کی پیشانی پہ کیسے چٹ سے بوسہ لے لیا۔ لو وہ بیٹھ بھی گئے۔ جانے وہ کیوں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا شرم! بھئی اماں اتنے چاؤ سے سیویاں کھلا رہی ہیں تو کھا کیوں نہیں لیتے۔؟"

"اور تو سب گھر میں خیریت ہے خالہ بی۔؟" وہ بڑی شرما شرمی سے پوچھ ہی لیتے۔
خالہ بی کے چہرے پہ ہنسی کی لہر سی آتی مگر وہ سنجیدہ ہو جاتیں۔ "ہاں اللہ کا فضل ہے۔"
"اے لو، کیسی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ اب بھابی دُلہن سامنے بیٹھی ہیں، منّا وہیں اچھل پھاند رہا ہے۔ بھیا ساتھ بیٹھے سٹوں میں حقہ لگا رہے ہیں، ابّا تو ہوں گے ہی بیٹھک میں۔ پھر آپ کس کی خیریت پوچھتے ہیں۔؟ بھئی یہ، واہ، ذرا سی شرم بھی تو نہیں آتی!"

بھابی دلہن جان بوجھ کر اندر آجاتیں اور نند ہونے کے ناطے مذاق کرنے سے کبھی نہ چوکتیں۔ "اے بی یہ جھری سے لگ کر کیوں بیٹھی ہو۔؟"

"ہائے بھابی دُلہن قسم لے لو جو میں نے کسی کو دیکھا ہو، مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اماں تو پاس بیٹھی خود ہی منہ میں لاڈ سے سیویاں بھرے جا رہی ہیں، پھر میں......"

"کیوں ری بدذات! تو نے دیکھا نہیں تو آپ ہی آپ یہ غیب حال کیسے معلوم ہوگیا۔؟"

"اب بھابی دلہن کو کون بتائے! بھلا منگیتر کو دیکھے بنا کیسے رہا جا سکتا ہے۔؟ ہائے اتنی دور سے تو بیچارے عید کو آئیں اور کوئی انھیں دیکھے بھی نا! ایسا کیا بھابی نے کبھی بھیّا کو نہ دیکھا ہوگا۔" وہ جان بوجھ کر ہاتھ ہلانے لگتی کہ چوڑیاں کھنکھنا اٹھیں اور وہ سمجھ لیں کہ اتنی دور آنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔ "ہاں جی تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی سرحد میں داخل ہونے کو ابھی تھوڑے بہت دن باقی تھے۔ مگر اکو ماں یہ تو جانتی تھی کہ سلیمان میاں کے نام سے ان کی کلیاں مہکنے والی ہیں۔ اب جو جان جوان موت کی خبر ان کے کانوں میں پڑی تو اُسی دم وہ کلیاں مرجھا گئیں۔ اتنے دیر میں کتنے خیال آئے اور چلے گئے۔ آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ اماں ایسے ہلک ہلک کر رو رہی تھیں:۔

"ہائے میری اکو کا کیا بنے گا؟ ہائے میری لاڈلی!"

اماں کو یوں روتے دیکھ کر اختر کی آنکھوں سے بھی ندی سی اُبل پڑی۔

(۲)

اُس دن صبح اختر اپنے بستر پر سے اُٹھی تو چھوٹی سی ریشمی رضائی کو لات مار کر دور گرا دیا۔

"اتنی سی رضائی لے کے میرے پلے باندھ دی۔ سر ڈھانکوں تو پیر باہر نکل پڑتے ہیں۔ پیر ڈھانکوں تو کم بخت سر کھلا رہ جاتا ہے۔" وہ بستر پر سے انگڑائی لیتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عازبیگم نے سہم کر سر اُٹھایا۔

جوانی یوں چپکے سے کیسے گھر گھس گئی؟ ارے بیٹی کی جوانی تو ڈھول تاشے بجاتے آتی ہے پہلے آنکھوں کی پلکیں گہری اور لمبی ہو جاتی ہیں، پھر آنکھیں آپ ہی آپ جھکی جھکی رہنے لگتی ہیں۔ بازوؤں پر صندل کی شاخوں کا گمان ہوتا ہے اور پیر سُونے سُونے بھی ہیں تو لگتا ہے چلتے میں پائلیں سی چھنک رہی ہیں۔

یہ کیسی جوانی ہے خدایا! جو یوں خاموشی سے گھر میں گھس گئی۔ پلکوں کی وہ جھالر چھپی چھپی کیوں تھی۔؟ آنکھوں میں وہ شرمیلا انداز کہاں تھا؟ بازو صندل کی شاخوں ایسے کب لگے؟ اور تو اور چلتے میں کبھی پائل نہ چھنکی اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہوگیا۔ راتوں رات اس باغ پر بہار کیسے آگئی کہ کالی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ دبیز سے دبیز ہوگیا۔ آنکھیں جھلمل جھلمل قندیلیں سی بن گئیں، رہ رہ کر جگمگاتی اور کانپتی سی قندیلیں، بازوؤں میں رس بھر گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کب ہوا۔؟ اور

جب اکو ماں بستر سے اُٹھ کر حمام تک گئی تو خاموش آواز کے ساتھ یہ چھما چھم کیسی۔؟ مگر اب بہار کو قید کیسے کیا جا سکتا ہے۔ سرسراتی ہوائیں تو آپ بتا دیتی ہیں:۔ "لو بھئی بہار آگئی ۔ بہار آگئی بہار آگئی۔"

عارفہ بیگم کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ وہ سہمے ہوئے دل سے اس بہار کی منتظر تھیں بھرے گھر میں یہ ایسی کیسی بہار آئی کہ بجائے خوشی کے دل ڈوبنے لگا۔

عزیز میاں کے لئے حقہ گرم کر کے بیٹھک میں لے گئیں تو عارفہ بیگم یوں چپ چاپ تھیں۔

"کیا بات ہے ۔۔؟" عزیز میاں حقہ گڑگڑا کر بولے۔

اُنھوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور ذرا بے لبسی سے بولیں:۔

"اپنی اکو ماں سیانی ہو گئی ہے۔"

اپنے لگائے ہوئے درخت پر پھول کھلیں، بہار جھومے تو چہرے پر ہنسی آتی ہی ہے۔ خوش ہو کر بولے:۔

"اچھا ۔"

عارفہ بیگم نے حیرت سے میاں کو دیکھا۔" آپ تو یوں مطمئن ہیں، ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کہوں یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہوئی۔؟"

عزیز میاں نے حقہ گڑگڑایا۔

"اور مجھے تو اس میں رنج ہونے کا کوئی تک نظر نہیں آتا۔ بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے کہ بیٹی جوان ہوگئی۔؟"

عارفہ بیگم نے ترس بھری نگاہوں سے نادان میاں کو دیکھا۔

"مزدور اپنا بوجھ زمین پر اتار کر خوش ہوتا ہے، سر پہ دھرا رہے تو اس کی جان گھُو کھلی پڑ جاتی ہے۔"

عزیز میاں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر خود کو مطمئن بنا کر بولے:۔

"وہ تو ٹھیک کہا تم نے، مگر خواہ مخواہ فکر مول لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا۔؟"

"خواہ مخواہ کی فکر ۔۔؟" وہ درد سے مسکرائیں:۔ "یہ تو اتنی بڑی پریشانی کا سودا ہے۔ میری تو ابھی سے جان آدھی ہوتی جارہی ہے ۔"

"ارے دنیا کی بیٹیاں جوان ہوا کرتی ہیں، مگر کہیں مائیں یوں پریشان ہوا کرتی ہیں۔؟ ہم نے تو ایسے موقعوں پر ماؤں کو مٹھائی بانٹتے دیکھا ہے۔ خوشی خوشی عزیز رشتہ داروں کو جوڑتی ہیں، گانا بجانا ہوتا ہے، ہنگامے ہوتے ہیں۔ اور بات ہے بھی ٹھیک، مالی پھول کے کھلنے پر اداس

نہیں ہوتا، وہ تو پھولوں نہیں سماتا کہ چلو میری محنت ٹھکانے لگی ۔"

"مگر ہمارا پھول .....،" وہ آگے کچھ نہ بول پائیں ۔

"ہائے! آپ اتنی بڑی بات بھول رہے ہیں۔ بھلا اس کی شادی کیسے ہوگی ۔؟"

عزیز میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئے ۔

"کمال کی بات ہے ! ارے ہماری اکو ماں اتنی حسین، اتنی پیاری ہے کہ اس کے لئے ستر پیام آئیں گے اور ایک سے بڑھ کر ایک آئیں گے، بلکہ تمہیں تو یہ پریشانی اور الجھن ہو گی کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں"

عارفہ بیگم نے آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھ لیا ۔ "کاش ایسا ہی ہوتا ــــ"

"کاش ایسا ہی ہوتا ۔؟" میاں چونک کر بولے ۔ اس میں یوں روھانسا اور آزردہ ہونے کی کیا بات ہے بھئی ۔؟ ہوگا اور ایسا ہی ہوگا ۔

"مگر آپ اتنی بات بھول رہے ہیں، ہماری اکو کا منگیتر سال بھر پہلے ہی جان جوان مر چکا ہے ۔"

عزیز میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری ۔

"ہم چاروں کی کتنی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جاتا! ہو جاتا مگر، مگر قسمت کو کیا کہہ سکتے ہیں ۔؟ کیسے جوڑ کو جوڑ تھا، چاند سورج کی جوڑی تھی ۔ مگر عارفہ بی بی خدا کی مصلحت خدا ہی جانے ۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے، سوائے افسوس کے ! ۔"

دونوں خاموش ہو گئے، صرف حقہ کی گڑ گڑاہٹ باقی رہ گئی، عارفہ بیگم نے خاموشی سے کہنا شروع کیا ۔ "کل دُلہن بیگم کہہ رہی تھیں، حسینہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی ۔

"پھر ــ ؟" عزیز میاں نے ذرا تعجب سے پوچھا ۔

"ان کا خیال تھا کہ اختر کو اپنے بیٹے کو ....."

عزیز میاں نے مارے خوشی کے حقہ کی نے چھوڑ دی ۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اختر کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ۔ اجی دیکھا اس کے لئے ایک چھوڑ سو آئیں گے ۔ ہاں مگر وہ لڑکا کرتا کیا ہے ۔؟"

"شاید ریلوے میں ملازم ہے ۔"

"بھلا تنخواہ کیا ہے اس کی ۔؟"

"ساڑھے تین سو ۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں بولیں ۔

اُنھوں نے خوشی خوشی پھر حقہ کی نے پکڑلی۔ " تب تو کچھ ٹھیک ہے۔ آج کل کے زمانے میں ساڑھے تین سو کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ اور پھر وہ بی۔ اے پاس بھی ہے نا۔"

بیگم کچھ نہیں بولیں تو پھر بولے :۔

" اور ماشاء اللہ صورت شکل بھی خاصی ہے۔"

وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگے۔ عارفہ بیگم ٹھنڈے لہجے میں بولیں :۔

" تو حسینہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہے چاہو تو چاند سورج کے مقابل بٹھا دو۔ مگر ایسی منحوس لڑکی کو اپنی بہو بنا لیں جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو ـــ "

" منحوس ـــ" عزیز میاں چلّائے ۔ نے پھر ہاتھ سے چھوٹ گری۔ اُنھوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ " جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو !"

کتنی ہی دیر خاموشی رہی، پھر عارفہ بیگم بولیں :۔

" بس اتنے دنوں سے مجھے تو یہی ڈبکا لگا ہوا ہے، ورنہ کون بیٹی ایسی ہوگی جسے پیام نہ آتے ہوں، بُرے بھلے، کھٹے میٹھے، کیسے ہی بیر ہوں، پتھر تو مارے ہی جاتے ہیں۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ "

دونوں نے بڑی بے بس نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غم نے جیسے ان کے چہروں کی تازگی چھین لی ہو۔ دونوں کی آنکھیں خشک اور بے جان نظر آ رہی تھیں۔

مگر عزیز میاں اور عارفہ بیگم جس بات سے پریشان تھیں وہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ ابھی مہینہ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ اکو ماں کے لئے نسبت والے آگئے۔ لڑکا شہر میں کوئی ملازمت کرتا تھا۔ پچیس چھبیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ یعنی یہی کوئی دو ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ یعنی باپ نے ان باتوں میں سے ایک کو بھی بُرا نہ جانا۔ چار پانچ برس گزریں گے۔ دو چار بچّے ہوں لیں گے تو عمر کا فرق مٹ جائے گا۔ جسم بھاری ہو جائے گا تو خود اکو ماں میاں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے گی۔ تنخواہ کا کیا ہے۔ ؟ کھانے والی اپنی قسمت سے کھاتی ہے۔ بڑی چھان بین کر کے بھی دو گھر کھانے والی کے نصیب میں نہ ہو تو ہر ابھی سو کھا ہو جائے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

اور خاندان کا کیا پوچھنا پاچھنا تھا ؟ مسلمان تھے اور شریف تھے، یہی بس تھا ! منگنی کے وقت انگوٹھی پہنانے جب اُنھوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو، گو کہ یہ عین ناممکن سی بات تھی (بھلا شریفوں میں کہیں یوں بیٹیوں کی صورت شکل دیکھی بھالی جاتی ہے) پھر بھی عارفہ بیگم نے مصلحت اسی میں جانی کہ چپکے سے دُلہن کی شکل بتا ہی دیں، ورنہ کل کلاں کو وہ کہنے کو بیٹھیں گی :۔

" بھئی کیا شادی کرتے ؟ لڑکی کی ایک جھلک تو نہ بتائی۔ اب ہم کیا جانیں کیا بھید تھا جو بیٹی چھپائی گئی، اے کیا ہم مردے تھے کہ بٹیا کو کونے میں لے جا کے بٹھا دیا ؟ ـــ"

بیٹی کی شکل جس نے دیکھی اُسی کے منہ سے "ہا" نکل گئی۔ کسی منہ پھٹ نے تو منہ پھوڑ کے پوچھ بھی لیا:۔

"اے اتنی چاند سی صورت پر اتنی عمر ہوگئی۔؟"

عارفہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا:۔

"دوئی بن چاند سی صورت کا کیا ہے۔؟ بیٹی سیانی ہوتی تبھی وداع کرتے نہ کرلے کے یوں ہی کچّی ہنڈیا دسترخوان پر برت دیتے ہیں اور اتنی کم عمری میں ان کے باوا کی مرضی بھی نہیں" سمدھیانے میں لوگ یوں ہاتھ لمبے کر کر کے لڑنے بھڑنے کو تو جاتے نہیں ہیں، چپ رہ گئے مگر عارفہ بیگم کے جی کو ادھر پنکھے لگ گئے۔

"نکاح خوانی کے چار بول جب تک نہ پڑھائے جائیں، میرا جی تو یوں ہی ہڑکے گا۔ پھر بعد کو نیک بخت پر جو بھی گزرے سو گزرے۔"

"کیوں کیا ہوا۔؟" میاں ہڑبڑا کر بولے۔

"ہوتا کیا؟ بیٹا کی صورت دیکھی تو وہیں سامنے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایسی چاند سی صورت والیاں تو پنگوڑے میں ہی دوسرے کی ہو جاتی ہیں اور یہ تو اتنی بڑی ہوگئیں کہ چلنے میں زمین ہلا رہی ہیں۔"

عزیز میاں کھنجا کر بولے:۔

"ہونہہ! بکنے والے کو بکنے دو۔ شادی ہو جائے گی تو آپ ہی سبھوں کے منہ بند ہو جائنگے۔"

سمدھیانے والوں نے جب بنارسی سرخ دوپٹہ اُڑھا کر انگوٹھی پہنائی تھی تو بنا، سنگار پٹار کے اختر کی صورت ایسی چاند ایسی چمکنے لگی کہ سبھی لوٹ پوٹ ہو ہو گئیں اور جاتے جاتے بول گئیں:۔

"دوئی میں جلد ہی اپنی بہو کو بیاہ لے جاؤں گی۔ ایسے اجالے تو میرے گھر میں ہونے چاہئیں نہ بہن؟" وہ عارفہ بیگم سے مخاطب تھیں۔

"ہاں بہن۔ آپ ہی کی لڑکی ہے، جب بھی لے جائیے، چاہے اسی وقت۔"

"نا بہن، اس وقت کہاں لے جا سکتی ہوں؟ ابھی تو بیٹے کو چھٹی نہیں ملی، ورنہ میرا بس جو چلتا تو ساتھ ہی لے کر چلی جاتی۔"

کہاں تو بہو اتنی پیاری تھی کہ بار بار بہو کو دروازے میں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں۔ اور جلد سے جلد اُٹھالے جانے کا جتن تھا یا اب دو مہینے چھوڑ چھ مہینے گزر گئے اور کوئی ٹھور ٹھکانا ہی نہیں۔

ایک ایسی ہی ہلکی سی شام کو سمدھیانے کا آدمی ایک پرچی پکڑا گیا۔

بہن صاحبہ!

آداب عرض ہے۔ ہم تو بیٹی کی پیاری شکل دیکھ کر تب ہی چونکے تھے کہ ضرور دال میں کالا ہے مگر آپ نے بات کی تہ تک نہ جانے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا کہ صاحبزادی منحوس ماری ہیں، اپنے منگیتر کو کھائے بیٹھی ہیں، ورنہ جانے ہمارے گھر کا کیا حشر ہوتا۔ بہن آخر آپ کے دل میں بھی کیا محبت تو ہوگی ہی، پھر آپ اپنی اولاد کے لئے دوسرے کی اولاد کا برا کیوں چاہتی ہیں؟ آپ کے رویہ سے ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرئے بے چاروں کا جنہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور صورت حال سے مطلع کیا، ورنہ ہمارے گھر بھی اُلو بول جاتا۔ ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ ہمارا سرخ دوپٹہ اور سونے کی انگوٹھی، جو پورے سات ماشے کی تھی، واپس کر دیں گی۔

آپ کی بہن، سلطانہ بیگم

پرچی ہوا کے زور سے آڑی اُڑی، دیواروں سے سر ٹکرایا۔ برآمدوں میں گھومتی پھری، دالانوں میں رکی اور پھر ہوا کے ایک زناٹے دار جھکڑ کے ساتھ اکو میاں کی گود میں جا پڑا۔

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!!"

ہواؤں نے زور باندھا اور چلائیں:۔

"صاحبزادی منحوس ماری ہیں!"

دالان، پیش دالان، برآمدے خاموش آوازوں سے چلانے لگے:۔

"ہاں ہاں — صاحبزادی منحوس ماری ہیں!"

بی بی نے گھبرا کر میاں کی صورت دیکھی:۔

"میں نہ کہتی تھی کہ اب زندگی نے آزمائش شروع کر دی ہے۔!"

میاں کچھ نہ بولے۔ بولنے کو تھا بھی کیا؟

"جانے ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہوگا جو یوں راندے جا رہے ہیں۔" عارفہ بیگم تھکی ہاری سانس لے کر بولیں۔

"سکھ دکھ سب اسی کی دین ہے بی بی، برداشت کرو۔"

عارفہ بیگم کے آنسو بہہ اُٹھے۔

"نہیں ہوتا برداشت۔ بالکل نہیں ہوتا۔ کھایا پیا انگ نہیں لگتا، راتوں کی نیند اُڑ گئی۔
دل کا چین، آرام مٹ گیا۔ ہائے میری معصوم بچی! "
"برداشت کرو بی بی، برداشت کرو۔ اوپر والے کے پاس انصاف ہے۔ ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ برداشت کرو!"

(۳)

دوسرے دن عارفہ بیگم روز کی طرح صبح صبح چائے کی پیالی لے کر میاں کے بستر کے پاس گئیں تو وہ روز کی طرح بی بی کے قدموں کی چاپ سن کر اُٹھ کر نہ بیٹھے۔ بی بی نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔
"چائے لیجیئے۔ کلی کا پانی بھی رکھے جا رہی ہوں۔"
عزیز میاں منہ اندھیرے ہی اُٹھا کرتے تھے۔ پاس والی مسجد میں جا کر نماز پڑھ کر آتے۔ منجن مل کر دانت صاف کرتے، منہ ہاتھ دھوتے، پھر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتے۔ پارے دو پارے پڑھ کر وہیں پلنگ پر لیٹ جاتے۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ ادھر چولہے بھی جل جاتے۔ بی بی میاں کو سوتا پا کر جلدی جلدی خود اپنے ہاتھوں چائے تیار کرتیں اور چائے کی پیالی اور کلی کے لئے پانی لے کر جگانے آجاتیں۔ نیند گہری ہوتی تو وہ پانی اور چائے کی پیالی وہیں پٹی کے سرہانے دھو کر چلی جاتیں۔
پانچ، دس، منٹ کے بعد پھر آواز دیتیں۔
"اے اُٹھئے بھی۔ ٹھنڈی پالا ہو جائے گی تو کیا مزہ آئے گا" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے۔
آج بیٹھے بیٹھے اُنھوں نے آواز دی:۔
"اجی اُٹھئے بھی۔" مگر میاں یوں ہی سر سے پیر تک رضائی اوڑھے پڑے رہے۔
پانچ، دس، پندرہ، بیس منٹ چھوڑ گھنٹہ گزر گیا۔ بی بی اُٹھیں اور اُلجھ کر بولیں:۔
"دوئی ایسی بھی کیا نیند کہ جوانوں سے بڑھ کر ہو گئی۔ اس سے جلد تو ظہیر میاں اُٹھ جاتا ہے ۔۔"
قریب آکر زور سے شانہ ہلایا۔ پھر بھی نہ اُٹھے تو مُنہ پر سے رضائی کھینچی۔ بڑی مشکلوں سے رضائی کھینچ سکیں۔ وہ منہ پر جھکیں۔
"دوئی کم بخت چائے تو دیکھئے کہ......"

مگر الفاظ ان کے ہی رہ گئے۔ اک دم وہ چلانے لگیں۔

"ارے دیکھو تو۔۔۔ سنو تو۔۔۔ یہ تو بولتے ہی نہیں!۔"

بیٹا، بیٹی اور بہو دوڑے ہوئے آئے۔ رضائی الگ کر کے دیکھا کہ ابّا میاں ہمیشہ کے لئے سو چکے ہیں۔

(۴)

جیسا کہ وقت عارفہ بیگم پر پڑا، خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ امیر گھر کی لاڈوں، نازوں میں پلی اکلوتی اولاد تھیں۔ بھلا گھر میں کس بات کی کمی ہوگی؟ شادی ہو کر سسرال کو آئیں۔ یہاں بھی اللہ کا فضل تھا، بڑی ساری زمینداری تھی۔ اگر روپوں کو کھوندتی نہ چلتی تھیں تو یہ بھی نہ تھا کہ پیسے کو ترستی ہوں۔ ہزاروں سے اچھی حالت تھی۔

پھر سسرے مرے تو جائداد کا بٹوارہ ہوا۔ تین دیور، دو جیٹھ، ساس، نندیں، سب کے حصّے بخرے لگے، پھر بھی خوش تھے۔ یوں کہ اپنے آگے اپنی دال روٹی ۔۔۔ وہی بس تھی۔ اگر دل کو اطمینان و سکون میسّر رہے تو دال روٹی تو پھر بھی اچھی بات ہے، فاقے بھی بُرے نہیں لگتے۔ اور اطمینان و سکون کیوں نہ ملتا؟ میاں دل و جان سے داری۔ اولاد بھی اللہ نے دے رکھی تھی ایک بیٹا، ایک بیٹی، زندگی سکون سے گزرتی تھی۔ گھر کی آمدنی تو تھی ہی۔ جوان ہوئے تو بیٹے ظہیر میاں بھی نوکری سے لگ گئے۔ یہیں بڑے زمیندار خلیل خاں کے کاموں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ ڈھائی سو، دو سو اُن کے بھی آتے تھے۔ بیٹا جوان ہو تو ماں باپ کو اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں اور پھر کماؤ پوت بھی ہو تو پھر گھر میں خوشیوں کی بھری برسات برسنے لگتی ہے۔

مگر یہ تو پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کس کے نصیبوں میں کیا بدا ہے۔

بیٹی کی نسبت بھی بچپن ہی سے خلیری بہن کے بیٹے سے لگی ہوئی تھی۔ بیٹے کی شادی جٹھا کی بیٹی سے ہو چکی تھی، کسی بات کی، اگلی پچھلی کی فکر ہی نہ تھی، اطمینان سے بیٹھے تھے کہ بیٹی جوان ہوگی تو بہن اُٹھا لے جائے گی۔ گھر میں جی بہلانے کو پوتا تھا اور دوسرے کی آمد آمد تھی۔ مگر بیٹھے بٹھائے یہ ہوا کہ داماد سہرا بھی کیا باندھنے سے پہلے ہی کفن لپیٹ بیٹھے۔ بھرے گھر میں دُھول اُڑ گئی۔ جوان بیٹی کا ساتھ اور سارے میں بوم ہو گئی کہ منحوس ماری ہے بُرے بھلے میں دل کو سہارنے والے میاں تو سنگی ساتھی تھے، سو وہ بھی ان دکھوں کو سہار نہ دے پائے۔ اور چین سے آنکھیں موند کر ایسے سوئے کہ پھر کبھی نہ اُٹھے۔

"اب کیا ہوگا؟۔" عارفہ بیگم اپنے آپ میں بس یہی سوچے جاتیں اور کڑھتی جاتیں بیاں

کا چالیسواں ہوتے ہوتے اس کڑھاپے نے انھیں بڑھاپے کی آخری سرحد پر لے جاکر بٹھا دیا۔
آنکھیں سیاہ گڑھوں کے اندر چلی گئیں۔ ناک کا بانسہ نکل آیا، ہاتھ پیر جھولا ہو گئے۔ دیکھ کر ترس
آتا۔ اگر اکو ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو حالت اتنی تباہ نہ ہوتی اور اک دم سے اتنی بوڑھی نہ ہو جاتیں
مگر اب تو بھرے گھر میں کوئی چھایا ہوا تھا تو بس اکو ماں۔ بیٹیوں کی جوانیاں تو پونم کا چاند ہوتی ہیں۔
جو بادل کی اوٹ میں رہے یا نہ رہے بس چمکے ہی جاتا ہے۔ بادل نہ ہو تو پھر تو کیا کہنا، صاف
سیدھی طرف آسمان پر جگمگاتا رہتا ہے۔ مگر کالی سیاہ بدلیاں ڈھانپے رہیں پھر بھی اندر سے جھلک
مارتا ہی ہے۔ ایسے چاند کو کون سی بدلی ڈھانپنے کا حوصلہ کرے جس نے اپنے پورے پندرہ دن
پورے کر لئے ہوں۔؟

اتنے دن ہو گئے تھے، کوئی تو نہ پلٹا۔ جہاں وہم، وسوسے اور اندیشے گھیر لیں وہاں
نہ بیٹی کی خوبصورتی کام آئے نہ روپیہ پیسہ، سلیقہ کام آئے نہ تعلیم تربیت۔ عارفہ بیگم کھاتے پیتے
بیمار ہو گئیں، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ہنستے روتے بس یہی فکر، یہی دھن گھن کی طرح
کھائے جاتی۔

"اکو ماں کا کیا ہوگا۔؟ اکو ماں کا کیا بنے گا۔؟"

یہ گت تو آج کل سے نہیں اسی گھڑی سے نظر آرہی تھی جب سے کہ سلو میاں جان جوان
اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ کوئی ننھی منی سی امید کی کرن پھر بھی باقی تھی ہی، جو بھرے اندھیرے
میں اجالا کرنے کو کافی تھی۔ وہ میاں کا ساتھ تھا، مگر وہ کرن بھی جلتی بجھتی آخر کو دم توڑ گئی۔

سسرے کی موت نے دلہن بیگم کو شیر بنا دیا۔ پہلے یہ تھا کہ زمینداری کی آمدنی اور
ظہیر میاں کی تنخواہ مل جل کر آتی اور گھر کا خرچ چلتا تھا اور بغیر کسی چپقلش کے گزر ہوتی تھی۔
اب بھی وہی حال تھا۔ مگر ادھر عزیز میاں کیا مرے کہ دلہن بیگم نے یہ فرض کر لیا کہ گھر کی ساری ضرورتیں
بس میرے میاں کے پیسے سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یہ خیال جو ان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا تو انھوں
نے ساس نند کے دل چھید ڈالے۔ میاں کے دل پھیرنے میں کوئی جتن نہ اٹھا رکھا۔ باپ کی موت
پہ جائداد بیٹے کو ملنے ہی تھی، اور ملی بھی۔ اب ماں بہن کا کیا رہ گیا تھا؟ بس دو وقت کی روٹی اور
تن بھر کپڑے کی حقدار تھیں۔ وہ بُرے بھلے مل جاتا تھا، نہ بھی ملتا تو کیا کر لیتیں؟ اختر سے کوئی چیز
غلطی سے گر پڑ جاتی تو منہ زور جوانی کو طعنے پڑتے۔

"دوئی بی دیکھ کر نہیں چلتیں۔ یہ ٹکریں مار کر کیوں چلتی ہو؟ دودھ کا پیالہ گرا دیا، اب رات
کو منا روئے گا تو کیا پلاؤں گی؟ تمہارا خون؟"

اس پر بس ہوتا تو سہارا جا سکتا تھا، مگر کنواری نند کو ایسے طعنے دیتے بھی نہ چوکتیں:۔
"میری توبہ! اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ دہلیز کی مٹی اکھاڑ دی۔ یوں جوانی زور پر آئی ہوئی ہے تو جا کر میاں سے کشتیاں کیوں نہیں لڑتیں"
عارفہ بیگم سہم کر بولیں۔ دلہن بیگم کنواری ٹیا کے سامنے خدا کے لئے ایسی گمراہ کن باتیں مت کیا کرو۔ وہ کیا سوچے گی؟"
"اے لو! سنو! گمراہ کن باتیں! جیسے تمہاری بٹیا تو بڑی بھولی ہے نا۔ سکھی سہیلیوں سے گھنٹوں سر جوڑے کیا باتیں ہوتی ہیں؟ کوئی جانتا ہی نہیں جیسے!"
"تمہارے آگے بھی اولاد ہے دلہن بیگم، یوں جھوٹے الزام نہ تراشو! کون اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں جڑی ہوئی ہیں کہ باتیں مٹھارے گی۔؟"
دلہن بیگم کو قرار نہ آتا۔ ننھے بچے کے منہ میں چھاتی گھیڑتے ہوئے بولیں:۔
"اب کیا کیا سنائیں کیا کیا دیکھتے ہیں، میرے بچوں کو یوں بھینچ بھینچ پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ بے چاری کرے بھی کیا؟ بچوں کے لئے دل چاہتا ہوگا، مگر ماں نے تو کولہے سے لگا کر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ارمان پھلیں بھی کیسے؟"
اختر کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ "بھلا کون پھوپھی ہوگی جو اپنے بھتیجوں سے پیار نہ کرتی ہو گی؟ بھلا کیا میں اس لئے پیار کرتی ہوں کہ میرا جی ماں بننے کو ترستا ہے؟" دلہن بھابی اتنی گہری اور گھنی ہیں، اسے آج پتہ چلا۔ اماں تو ادھر سن ہی رہ گئیں۔
"دلہن بیگم خدا کے لئے یوں اپنا آپ بھول کر بات مت کرو۔ بھلا کہیں کنواری نندوں کو یوں طعنے دیئے جاتے ہیں"
"اے لو، طعنے دیئے ہی کس کم بخت نے ہیں؟ جو حقیقت تھی وہ بیان کر دی۔ ایسی ہی کڑی حقیقت طعنے بن بن دل چھیدتی ہے تو ٹیا کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں؟" دلہن بیگم نے جانتے بوجھتے صاف طعنہ مارا۔
"پیدا کرنے والے نے غم دیا ہے بی بی، تو خوشی بھی وہی دے گا! عارفہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

اکو ماں اب تک عمر کے ایسے دور میں تھی کہ جوانی کا احساس تو تھا، مگر اپنے مقدر کی تباہی کو اس سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کے بھائے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی کہ کنواری بیٹھی ہوں۔ سب ہی لڑکیاں ایک خاص عمر تک کنواری رہتی ہیں اور پھر ایک نہ ایک دن دلہن بن جاتی ہیں او

پھر سہاگن کہلاتی ہیں۔ دیر سویر سب ہی پر یہ سب گزرتی ہے، مگر بھاوج کے آئے دن کے طعنوں نے تو اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل سی مچادی۔ رہ رہ کر وہ اپنے سراپے کو آئینے میں جا جا کر دیکھتی اور سوچتی "ہائے میری بارات کب چڑھے گی۔"

اور یہ بات تو اس پر کھل ہی چکی تھی کہ منگیتر کی موت نے اسے سارے میں منحوس قرار دے دیا ہے۔ پھر کون ایسا جی گردے والا تھا کہ دیکھتے بھالتے اپنے بھرے پُرے گھر کی تباہی کے لیئے منحوس کو بیاہ لے جاتا! سامنے ہی بوڑھی ماں تھیں جو ہر لمحہ موت کی طرف لپک رہی تھیں۔

"میں نہ ہوتی تو اماں کو یہ غم کیوں کھاتا" غم کو ہلکا کرنے کا واحد طریقہ دونوں ماں بیٹی کے پاس یہی تھا کہ آنسو بہائیں، اور اب تو وہ حد آرہی تھی جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

ایک دن ماں نے بیٹے سے سہمے سہمے کہا: "بیٹا ظہیر میاں! جوان بہن کا بوجھ سر پر ہے تمہیں فکر نہیں ہوتی؟ کوئی پیام ڈھونڈو نا، آخر کب تک بٹھلائے رہو گے؟"

ظہیر میاں نے نوالہ اُٹھاتے اُٹھاتے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولے: "ہاں ہر گھر پر اب جا کر دستک دوں گا اور کہوں گا کہ بھئی میری ایک جوان بہن ہے، تمہارے ہاں کوئی لڑکا ہو تو میری بہن کو کر ڈالو نا!"

ماں نے حیرت اور بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

"دوئی بیٹا ایسی جلی کٹی باتیں کاہے کو کرتے ہو، میں نے بھلا یوں کب کہا؟"

"اور آپ کا مطلب کیا ہے؟ بس مجھے اتنا ہی کام تو رہ گیا ہے کہ مشاطہ بن کر پیام ڈھونڈتا رہوں۔ انسان دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ بھلا کیا لڑکے بازاروں میں مولی گاجر کی طرح بکتے ہیں کہ گئے اور سیر دو سیر تلوا لائے۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا میاں! ہاں ذرا خیال دلانے کی بات تھی میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی تو بہن ہے۔ تمہارے آس پاس دوست احباب تو ہوں گے ہی۔ خاندان کی بات ایسی ہے کہ سب ہی جانتے ہیں کہ سلو میاں کی جوان موت سے اکو ماں پر یہ قہر ٹوٹا، باہر والوں کو مشکل ہی سے پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہہ سُن کر بات لگو اسکو تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے چچا تایا کی اولاد ہیں، یا تو شادی شدہ ہیں یا پھر اکو ماں سے چھوٹی، ورنہ میں آپ ہی منہ پھوڑ کر بول دیتی کہ میری بیٹی کو اُٹھا لو۔

"بھلا میرے دوستوں میں کون اس لائق ہے؟ ابّا میاں کوئی ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں، ہماری برابری کا کون ہے؟"

اماں نے دبی زبان سے کہا:۔

" شکور میاں تو مجھے بھلے خاصے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ برابری ورابری کا سوال اُٹھا بیٹھو بیٹھے۔ بس شادی ہو جائے۔ یہی غنیمت ہے، لاکھ تمہارے باپ ماں کا نام بڑا تھا مگر شکور میاں کے باپ کون گرے پڑے ہیں! بس غریبی سے مارے گئے، ورنہ خاندان تو ایسا ہے کہ کوئی کھوٹ خرابی نہیں۔ اور میرے خیال سے شکور میاں کی تنخواہ چار سو سے کیا کم ہو گی؟"

" اماں!" ظہیر میاں ہاتھ روک کر بولے " پہاڑ کتنا بھی اونچا ہے، آسمان سے نیچا ہی رہتا ہے شکور میاں لاکھ امیر کبیر ہو جائیں، ہماری ساکھ کو کیا پہنچیں گے۔ میں کب نہیں کہتا کہ کھاتے کماتے نہیں ہیں، مگر ان کی خود ہی ہمت نہ پڑے گی کہ اس گھر میں پیام لے جائیں جہاں سے ان کی روزی بٹتی تھی۔"

" روزی بٹتی تھی تب بٹتی تھی۔ اب تو اللہ نے ناک اونچی کر دی ہے۔ کہنے والے یہی کہیں گے ناکہ عزیز میاں کی بیوی نے اپنی بیٹی فقیروں میں دے دی، سو کہتے پھریں، ہماری بیٹی تو خیر سے اُٹھ جائے گی۔

کسی زمانہ میں جب عزیز میاں کا بول بالا تھا۔ تب انھوں نے رحیم بیگ کے بیٹے شکور میاں کے لئے وہ کچھ کیا ہو ایک باپ ہی اپنے اولاد کے لئے کر سکتا ہے۔ محلے ٹولے کے بچّے اسکول جاتے تو شکور میاں پھس پھس روتے:۔

" میں بھی اسکول جاؤں گا، میں بھی پڑھوں گا۔"

اسکول جانے کے لئے کتابیں لگتی ہیں، فیس لگتی ہے، اچھے کپڑے لگتے ہیں اور یہ سب ان کے پاس کہاں تھا؟ یوں ہی ایک دن عزیز میاں رحیم بیگ کے ہاں بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ اندر سے دھنا دھن مارنے کوٹنے کی سی آواز آنے لگی۔

" یہ آواز کیسی ہے؟" وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔

رحیم بیگ ہنسنے لگے:۔" بی بی باجرے کی بھٹے کہاں سے آئے؟ وہ حیرت سے بولے۔

" اجی جناب لونڈے نے دھوم مچا رکھی ہے کہ اسکول میں پڑھوں گا۔ اس کا باپ کوئی رئیس اعظم تو ہے نہیں۔ سالا پڑھے کیسے؟ روز وہی سبق پڑھاتا ہے اور کبھی ماں سے پٹتا ہے اور کبھی باپ سے۔"

عزیز میاں غصے سے بولے:۔ خود جاہل رہے، اولاد کو بھی جاہل رکھو گے؟ داخل کر کیوں نہیں دیتے؟ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی اس کی پڑھائی میں؟"

شکور میاں اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ مہینے کے مہینے چپکے سے فیس، کتابیں، کپڑے، قلم اور کاغذ، سب کچھ پہنچ جاتا۔ باپ کو کبھی پریشانی کا احساس ہونے ہی نہ پایا۔ وہ تو اچھا تھا کہ اختر بی کی نسبت بچپن ہی سے خالہ زاد بھائی سے طے تھی ورنہ لوگوں نے پہلے تو ٹوہ لگا کر یہی افواہ اڑانی چاہی کہ:۔

"میاں جی بیٹا کے لئے بر ڈھونڈ رہے ہیں"

ایک درجے سے دوسرا درجہ، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا اور پھر وہ دن آیا کہ شکور میاں نے ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اور اب تو وہ سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے تھے اور مہینے کے ختم پر ساڑھے چار سو کے کرکرے نوٹ جیبوں میں ٹھونسے گھر آتے۔ شہر میں گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ماں باپ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا تھا۔

شکور میاں تھے تو باپ کی اولاد، مگر اپنے باپ کی ذرا تو خو بو نہ تھی۔ باپ جھکی ہوئی ڈال تھے، جس سے ملیں گے جھک کے، بیٹے سدا اکڑے اکڑے رہتے۔ عارفہ بیگم کو خالہ بی خالہ بی بولتے تھے۔ اب بچپن سے ہی آنا جانا ہو تو کون پردہ کرتا ہے۔ نہ خالہ بی سے پردہ تھا اور نہ اکو ماں سے۔ اب تو وہ شہر میں نوکر ہو گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ بھی ملا ہوا تھا، کبھی ماں باپ سے ملنے گھر آتے تو خالہ بی سے ملنے چلے آتے تھے۔ کوٹ پتلون اُڑائے ہوئے، اونچے پورے وجیہہ، شکیل۔ اپنے میں آپ مرے جاتے مگر نگاہ نیچے کی اوپر نہ ہوتی۔ کبھی اختر سامنے سے گزرتی تو یوں چھچلتی نظروں سے دیکھ لیتے جیسے بڑا بیگار ٹال رہے ہوں۔ نہ چہرے پہ مسکراہٹ، نہ کوئی ہنسی کی جھلک۔ وہ سلام کرتی تو نظریں چرا کر جواب دیتے:۔

"آداب عرض!" معاملہ ختم۔

بھلا عزیز میاں اور عارفہ بیگم کو پڑی بھی کیا تھی کہ ان کے اس سلوک کا بُرا مانتے۔ ہاں بھئی اگر بیٹی دینے دلانے کا سوال ہوتا تو ایک بات بھی تھی، مگر وہ تو بیاہی جیسی تھیں، مگر اب تو عارفہ بیگم کو شکور میاں کے رنگ ڈھنگ کھل کھل جاتے۔ ان کے تو سارے گھرانے کو پتہ تھا کہ بٹیا کی بچپن کی نسبت ختم ہو گئی ہے، منحوس تھیں یا مبارک تھیں۔ جیسی بھی تھیں، تھیں تو ان کے محسن کی بیٹی۔ کیا جاتا اگر دولہن بنائے جاتے؟ مگر وہ تو ایسے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔

اس دن بھی، کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے۔ خالہ بی سے ملنے چلے آئے۔ بیٹھے خالہ بی سے باتیں کر رہے تھے کہ اختر اندر سے پان لئے آئی، دھان پان سا جسم، گوری گوری سی رنگت، آنکھیں کٹیلی، چمکتی بجلیاں سی، شاید نہا کر اُٹھی تھی کہ بال شانوں سے گر کر ساری پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں آکر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تو کون جی والا تھا کہ مر نہ مٹتا؟ مگر وہ شکور میاں کہ ایک لمحے کو چونک کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے گھبرا کر یوں نگاہیں ہٹا لیں جیسے اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو نگاہیں حل ہی تو جاتیں۔

ایسے ڈھنگ ہوں تو کوئی کیا آس باندھ سکتا ہے؟

بیٹے اگر کسی لڑکی پہ ریجھ جائیں اور اڑ کر بیٹھ جائیں کہ "نہیں کروں گا تو بس اسی سے"

تو ماں باپ لامحالہ ہار جاتے ہیں۔ مگر ماں باپ کسی بیٹی کو پسند کرلیں اور بیٹے کی جان کو آئیں تو بات بالکل نہیں بنتی۔ زندگی تو بیٹے بہو کو گزارنی پڑتی ہے، اگر بنا مرضی گلے میں ڈھول ڈال کر باندھ بھی دیا تو وہ بجائیں گے کاہے؟ کون جانے رحیم بیگ اور ان کی بیوی نے دل ہی دل اختر کو بہو بنانے کے بارے میں سوچا بھی ہو مگر شکور میاں کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ تو بس خاموش ہی رہیں گے۔

اتنے پر بھی عارفہ بیگم خاموش نہ ہوئیں۔ مانا کہ شہر کی کوئی چربانک دل پر چڑھ بیٹھی ہوگی، مگر پھر بھی شادی ہو جائے گی، دو چار بال بچے ہو جائیں گے تو خود ہی دل مل جائیں گے۔ گھر بھر جاتا ہے تو منہ نہیں پھیرا جاتا۔

ہیر پھیر سے پوچھا بھی، خود ظہیر میاں کے دوستوں نے بھی ٹوہ لگائی، مگر کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔ وہ تو ہونٹ سیے بیٹھے تھے۔ نہ یہ پتہ چلا کہ مرضی ہے یا نہیں، نہ یہ پتہ چلا کہ پھر آخر کس سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں! عجب کم بخت لوگ ہیں۔

اختری بی کے نصیبوں کا یہ ستارہ بھی ایک جھلک دکھلا کے چمکا اور پھر ڈوب گیا۔

(۵)

بھاوج تو چاہتی تھیں کہ جیسے بنے تیسے نند اس گھر سے ٹلے۔ ان کی چلتی تو کسی بھک منگے کو اٹھا کر دے ڈالتیں۔ مگر قسمت سے کوئی بھک منگا بھی تو نہ پلٹا۔ بھائی جیسے بھی تھے، جو چیز لاتے دونوں کے لئے، چاہے وہ کھانے پینے کی ہو یا اوڑھنے پہننے کی۔ انھیں یہ حصہ داری بھلا یہ کاہے کو بھاتی؟

"دو دو بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بتایا کرتیں۔

اتنی عمر میں تو ہم نے دو بچّے پیدا کر لئے تھے، اور حمل ساقط ہوا وہ الگ۔"

محلے ٹولے میں شادیوں کا موسم آتا تو آئے دن دعوتیں آتیں۔ نہ جائیں تو رشتے ناطے کیسے باقی رہیں؟ ورنہ مغرور گنائے جائیں، جانا ہی پڑتا، اختری پڑھی لکھی، گنوں بھری، اور پھر عزیز میاں زمیندار کی بیٹی، اوپر اوپر جھیلی جاتیں۔ گھر والیاں ان کے ذمہ میں سارا کام لگا دیتیں۔ دلہن کا سنگھار مسی بھی وہی کریں، دان دہیز بھی لوگوں کو وہی بتائیں۔ بیٹیاں کام سے منہ کیسے پھیریں؟ ننھی منی دلہنیں، کوئی بارہ کی، کوئی تیرہ کی، کوئی چودہ کی، کوئی پندرہ کی، کسی کی بہت ہی عمر ہوگی تو سولہ کی۔ حد ہوگی سترہ۔ یہ ہونٹوں پر مسی کی تہہ جماتیں تو کوئی طعنہ دل چھید جاتا۔

"دو دو بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بتایا کرتیں!"

سسرال کا چڑھاوا چڑھاتیں، کالی پوت کا لچھا پہناتیں تو سسنا تا تیر آتا:۔

"یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ کرے بھی کیا بے چاری۔؟"

زمین کے اندر جو بیج سویا ہوا تھا، بھاوج نے پانی ڈال ڈال کر اگا چھوڑا۔ باہر کس قدر تیز دھوپ تھی! کیسی کٹھن اور تلخ زندگی! یہ پودے آگاہی کیوں کرتے ہیں کہ فضول تیز بھری ہواؤں اور جلتے سورج کا سامنا کرنا پڑے!

خدا دعائیں نہ سنے، دلی آرزوئیں پوری نہ کرے تو انسان کا یقین ڈگمگا جاتا ہے۔ یہیں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے، کفر کا فاصلہ یہاں سے کم رہ جاتا ہے۔

گاؤں کی سرحد سے لگ کر ایک ندی بہتی تھی، اُس سے لگ کر کالی مسجد تھی اور کالی مسجد سے لگ کر بڑے پیر کا سفید مزار، کہنے والے کہتے تھے یہاں مانگی گئی ہر مراد پوری ہو جاتی تھی اور خصوصیت سے کنواری بیٹیوں کی ماؤں نے جب بھی پریشان ہو کر بروں کی دعا مانگی۔ دیر سویر، بُرے بھلے بر جڑ ہی گئے۔ اتنے اونچے سارے مزار کی ایک مجاور رکھوالی کرتا تھا۔ نیاز نذریں بھی وہی قبول کرتا تھا۔

اس دن عارفہ بیگم نے بیٹی کے ہاتھ میں چوڑیاں لا کر پہنائیں تو اختر کا جی ڈوب سا گیا۔ دل خون ہو کر جیسے بہہ اٹھا۔

"اماں یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

ماں نے بیٹی ہی سے راز چھپانا چاہا: "ایسے ہی منیاری والے کے پاس اچھی چوڑیاں نظر آئیں تو تیرے لئے لے آئی۔"

مگر وہ مزار کی ہری باریک چوڑی سب سے الگ نمایاں نظر آ رہی تھی اور اختر کا منہ دیکھ کر جیسے منہ پھوڑ کر بول اٹھی:۔

"نہیں نہیں، مجھے تو تمہاری اماں منت مان کر مزار سے لائی ہیں۔ میں بھلا ان بانکوں کی بہن لگتی ہوں؟ میں تو تمہارے سہاگ کی مسرت ہوں۔ مجھے توڑو نہیں، مجھے گھورو نہیں۔"

اختر نے بے بسی سے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

"اماں خدا کو نہ بھولئے، وہی سب سے بڑا سہارا ہے، وہی دلوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔"

گھٹنوں میں دھنسا ہوا سر رہ رہ کر کانپتا رہا۔

کوئی دو چار دن بھی نہ گزرے ہوں گے، عارفہ بیگم چوڑی کی کرامت کی منتظر ہی تھیں کہ اس دن ان کو اکو ماں کے ہاتھ ٹٹولتے نظر آئے۔

ان کا جی دھک سے رہ گیا۔

"چوڑیاں کیا ہوئیں بیٹا؟" اُنھوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"حمام میں ٹھوکر لگی اور ساری کرچی کرچی ہوگئیں ۔ دو ایک باقی رہ گئیں تو میں نے آپ ہی پھوڑ ڈالیں" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"ہائے بیٹی ان میں تیرے سہاگ کی چوڑی بھی تھی ۔" اُنھوں نے چلاّ کر کہنا چاہا مگر آواز وہیں کہیں دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی ۔

"منت ماننے سے سہاگ نہیں ملا کرتا اماّں ۔سب قسمت کی بات ہے" اس نے رو کر کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے گلا پکڑ لیا۔

"سب قسمت کی بات ہے، سب قسمت کی بات ہے!"

(۶)

عید پر پندرہ دنوں کی رخصت لے کے شکور میاں گھر آئے ہوئے تھے ۔عید سے پہلے خالہ بی بی سے ملنے آئے، خالہ بی کے دل میں چاند سا چمکا ۔ "یہ بار بار میرے گھر کے پھیرے کیوں کرتا ہے؟" اختر باہر آئی تو شکور میاں نے سہم کر اور پھر چونک کر یوں جلدی سے نگاہیں ہٹالیں کہ اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو وہ نگاہیں وہیں جل کر رہ جاتیں ۔

نفرت کا وہی پرانا انداز! خالہ بی کے دل کا چاند وہیں ڈوب گیا۔

"حیا، مروت بھی کوئی چیز ہے۔ خلوص، محبت، انسانیت تو دنیا سے اُٹھ ہی گئی ۔بھلا یہ شکور میاں اختر ایسی بیٹی کو کر لیں تو کیا بُرائی ہے؟ اختر ایسی دلہن سے تو گھر بھر میں جھما جھم آجائے بھر جائیں ۔مگر کرے کون؟ اُنھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔

ایک دن صبح اکو ماں ناشتہ کرتے کرتے بولی:۔

"اماں رات میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا"

"کیا؟" اماں نے لاپرواہی سے پوچھا ۔

"یہیں اماں مجھے ایسا لگا کہ آپ اور میں، وہ کالی مسجد کے ساتھ والا اونچا سا مزار ہے نا، وہاں کھڑی ہیں، بس دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دھکا دے کر مجھے ندی میں دھکیل دیا" اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

اماں چونکیں اور چلاکر پوچھا:۔ "میں نے؟"

اختر نے سکون سے جواب دیا۔ "ہاں اماں آپ نے۔"

عارفہ بیگم ہنسنے لگیں۔ "واہ ری لڑکی! خواب بھی کیا دیکھا نا۔ سیدھی کروٹ سویا کر۔"

دوسرے دن ناشتے پر اختر ماں سے بولی:۔

"اماں رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا، جیسے میں اور آپ مزار کے اونچے چھجے پر کھڑی ہیں اور اک دم آپ نے دھکا دے کر لوٹ دیا" وہ رکی اور ماں کو دیکھتی ہوئی بولی، اور اماں میں چلّا رہی ہوں، میں مرنا نہیں چاہتی۔ اماں مجھے دھکا نہ دیجئے، مگر آپ نے ایک نہ سُنی اور بولیں:۔

"تیرا مرنا ہی ٹھیک ہے، اور مجھے لوٹ دیا، جانے کیسا خواب ہے!" اس نے ماں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

"روز روز وہی خواب دیکھتی ہے۔ دماغ کی کمزوری ہے ساری" انھوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

اب عارفہ بیگم سدا ئی ادھیڑ بن میں دکھائی دیتیں۔ اختر دیکھتی، کبھی اماں اپنی مٹھیاں بند کر رہی ہیں، کبھی کھول رہی ہیں، کبھی اپنے آپ میں ہنستی ہیں، کبھی آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔ کبھی خود سے باتیں کرنے لگتی ہیں:۔

"نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے؟" پھر خود ہی جواب دیتیں:۔

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟"

ان ہی دنوں گاؤں میں جو بڑے زمیندار خلیل میاں تھے، ان کی بیوی کا یکایک انتقال ہوگیا۔ مرنے والی اپنے پیچھے ایک کنبہ چھوڑ مریں:۔ جوان بیٹیاں، جوان بیٹے، پوتے، پوتیاں، بہوئیں۔ خلیل خاں کا اتنا بڑا کاروبار، اتنی بڑی زمینداری تھی، گھر بھی خوب بڑا سارا۔ کھانے والے اتنے جی، بغیر گھر والے کے پتہ بھی ہل سکتا ہے۔ ظہیر میاں ان کے یہاں نوکری تو کرتے ہی تھے، خلیل خاں کو رنڈوا دیکھ کر اپنی بہن کا خیال آگیا۔

"اگر آپ کہیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہاں بس یہ بات ہے کہ وہ ذرا بوڑھے ہیں" وہ ماں سے بولے

"ذرا بوڑھے ہیں؟" عارفہ بیگم چلّائیں، "تمہارے باپ ان کی جوانی میں گھٹنے برابر کے تھے۔ اچھا جوڑا ڈھونڈا رے میاں تو نے اپنی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دیتا۔ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنویں میں ڈال دو اس کو۔"

اک دم اُن کے ہونٹ کانپ اُٹھے، دل دھڑک اُٹھا۔

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ اور میں اس چھجّے پر کھڑی ہیں اور اک دم آپ نے مجھے

لوٹ دیا۔"

ان کے دماغ پر دھیرے دھیرے اختر کا خواب چھانے لگا جو وہ مسلسل تین دنوں تک دیکھتی رہی تھی۔ "اس سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنویں میں ڈال دو اس کو۔"

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے دھکا دے کر......"

اُن کا دل ڈھڑ دھڑ کر اُٹھا۔ دھک..... دھک۔ تیز تیز ڈھڑکن۔ دھڑ..... دھڑ دھڑ..... دھڑ..... پھر دھیمی دھیمی رفتار سے دھڑکتے دھڑکتے ان کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔

جمعرات کے دن صبح ہی صبح، کہ ابھی تارے جھلکے ہوئے ہی تھے، عارفہ بیگم نے اختر کو جگا دیا۔

"بیٹی۔ او بٹیا۔ اکو ماں۔"

"اوں۔ اوں۔ جی۔" وہ کسمسا کر پھر سو گئی۔

بیٹی اُٹھو تو سہی۔ ذرا کالی مسجد تک چلیں گے۔"

"جی۔ کیا؟" وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"پیر صاحب کے مزار تک چلیں گے۔" وہ سکون سے بولیں۔

"کیوں؟" اُس نے چھوٹا سا سوال کیا

"نہیں بٹیا۔ رجب علی کی بیوی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ جمعرات کو منہ اندھیرے مانی گئی منت بالکل پوری ہو جاتی ہے۔ چل آج یوں ہی قسمت آزماتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کون سی منت ماننی ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"دل کا سکون بھی بڑی چیز ہے بیٹی۔ بس میں آج یہی منت ماننے والی ہوں کہ خدا تو میرے دل کو اطمینان دے، سکون دے۔"

"اچھا چلئے۔" وہ جوتیاں ٹٹولتی ہوئی بولی، "ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

ترل۔ ترل۔ ترل۔ نیچے ندی کا پانی بہ رہا تھا۔ ہرا ہرا سا، نیلا نیلا سا، صاف شفاف پانی۔ مزار کے سب سے اونچے چھجے پر عارفہ بیگم اور اختر کھڑی تھیں۔

"بہت سوں سے سُنا ہے اندھیرے وقت صبح ہی صبح مانی گئی منت پوری ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج جمعرات بھی ہے۔" اُنھوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

نیچے پانی بہہ رہا تھا اوپر وہ دونوں کھڑی تھیں۔

اختر نے ماں کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ بے جان بے جان سا اور سُتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "اماں آپ اس قدر پیلی کیوں نظر آ رہی ہیں؟" اس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں! میرا چہرہ! نہیں تو!" وہ چونک کر زور سے ہنسنے لگیں۔" تاروں کی روشنی میں پیلا نظر آ رہا ہوگا۔ اور بیٹا سچ تو یہ ہے..... وہ سنجیدہ ہو گئیں، کہ ادھر جب سے تمہارے باپ کا انتقال ہوا ہے دن رات روتے روتے اور فکریں اٹھاتے اٹھاتے میرا خون سوکھ گیا ہے۔ اور خون سوکھ جائے تو انسان پیلا نہ نظر آئے تو کیا ہو؟" وہ ذرا سا مسکرائیں، ان کی مسکراہٹ میں عجیب غیر یقینی انداز تھا۔

اختر نے بڑے سکون سے جواب دیا: "فکروں پر جی جلانے کی کیا بات ہے اماں؟ سوچنے سے فکریں کچھ کم تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ خود کو کڑھاتی رہتی ہیں۔"

"ہاں میں خود کو خواہ مخواہ کڑھاتی رہتی ہوں۔" وہ نیچے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولیں: "مگر میں آج خلوص دل سے دعا مانگنے آئی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آج میرے دل کو دائمی سکون مل جائے گا۔"

انھوں نے بے جان ہاتھوں سے پاس کھڑی اختر کو اپنی طرف کھینچا۔ ایک خوفناک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ چھا گئی اور انھوں نے اختر کو پوری طاقت سے نیچے کی طرف لوٹ دیا!

اختر کا پھول پان سا جسم پانی میں قلابازی کھا گیا۔ کچھ دور پر اس کا سر ابھرا، سیاہ بالوں میں چاند ایسا چہرہ چمکا اور ڈوب گیا۔ تھوڑی دور پر پھر اس کا سر ابھرا، پھر ڈوبا، پھر ابھرا ڈوبا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عارفہ بیگم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ہونٹ پھیلے ہوئے۔ یوں کھڑے کھڑے ایک صدی اُن کے سر پر سے گزر گئی۔ مردوں کی طرح وہ اندھیری سیڑھیوں پر سے اترنے لگیں کہ اک دم کسی سے ٹکرا گئیں۔

آنے والا کوئی مرد تھا۔

"ارے آپ؟ خالہ بی! یہاں ۔۔ ؟" وہ پہچان گیا۔ اک دم وہ خالہ بی کو اجالے میں لے آیا اور بڑی بے بسی سے گھبرا کر بولنے لگا: ۔

"خالہ بی، جانے کس نے مجھ سے بتایا تھا کہ جمعرات کی صبح مانی گئی منتیں قبول ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب گاؤں آتا ہوں تب ماتھا رگڑ رگڑ کر دعائیں مانگتا ہوں، مزار پر آ کر منتیں مانتا ہوں، مگر خالہ بی! ۔۔ مگر ۔۔ آپ سن رہی ہیں نا؟ مگر کبھی میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں زمین پہ رہنے والا ذرہ آسمان پر چمکنے والے ستارے کی آرزو کرتا ہوں خالہ بی۔ مگر کس منہ سے کہوں کہ میں اختر سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟ ۔۔ میں تو آپ کے گھر کا پروردہ ہوں۔ بھلا آپ لوگ کیا سوچیں گے۔ ڈر کے مارے کبھی ابا اماں کے سامنے اشارۃً بھی نہ کہا کہ وہ اک دم میرا دل نہ توڑ دیں۔

میں دل ہی دل میں اپنی محبت کا درد چھپائے رہا۔ اپنی حیثیت خوب جانتا ہوں خالہ بی، اس لئے کبھی اختر کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا اس کی تمنّا کیوں کروں؟ کیوں اس ناممکن سی بات کی آرزو کروں؟ مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا خالہ بی..... آج آپ کو اکیلا پاکر میری ہمت بندھ گئی۔ میں غریب ضرور ہوں خالہ بی، آپ لوگوں کی برابری کا دعویٰ نہیں، مگر آپ یقین مانیے میں اختر کو بہت خوش رکھوں گا، بہت اچھی طرح رکھوں گا۔ آج جمعرات ہے شاید میری دعا قبول ہو جائے!" اس نے کندھا پکڑ کر خالہ بی کو ہلا دیا۔

"میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے۔ یقین کیجئے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کہہ دیجیے خالہ بی۔"

خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہو گئی اور ان کے خوفناک قہقہے سنسان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بُری طرح شور مچانے لگے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

راشد چودھری
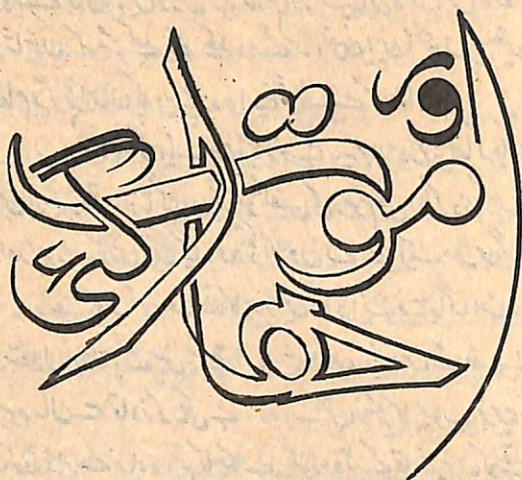
"رالف نیوس کے لئے دُعائے مغفرت کیجیئے۔"
ریس کورس کے لاوڈاسپیکر پر رندھی ہوئی آواز آئی۔
"ہم نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آخری دوڑ میں ایک حادثے کے نتیجے میں جاکی رالف نیوس فوت ہوگیا ہے۔"
تماشائیوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا زمین کی گردش رُک گئی ہے اور کائنات جامد ہو کر رہ گئی ہے، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ تھی، مرد عورتیں، بچے سب رو رہے تھے۔

ابھی کوئی نصف گھنٹے بیشتر نڈر، پستہ قد رالف نیوس اپنے گھوڑے پر سوار، دوڑ میں سب سے آگے تھا۔ اچانک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ منہ کے بل گرا۔ پیچھے آنے والے چاروں گھوڑے اُسے روندتے ہوئے گزر گئے۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہوگیا۔ کئی ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا، لیکن اس میں زندگی کی کوئی علامت موجود نہیں تھی۔ پندرہ منٹ گزر گئے، پھر بیس منٹ، پسینہ بھی خشک ہو چکا تھا۔ دل اور نبض کی حرکت بند تھی، لاش کو چادر میں لپیٹ کر قریبی ہسپتال بھیج دیا گیا۔
رالف نیوس کی موت کے اعلان کو تقریباً چالیس منٹ گزرے تھے کہ بیس ہزار تماشائیوں

نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ مردہ رالف نیوس تماشائیوں کی نشستوں کے سامنے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی تھا اور خون رس رہا تھا۔ اس نے صرف ایک ریشمی جانگھیہ پہن رکھا تھا۔ دوسرے جاکی، ریس کورس کے ملازم اور ہسپتال کا عملہ اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ فرط حیرت سے تماشائیوں کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رالف نیوس اس مقام پر گر پڑا جہاں کچھ دیر پہلے وہ اپنے گھوڑے سے گرا تھا۔

یہ ۱۹۳۶ء کی ایک سہ پہر کا ذکر ہے۔ یہ پہلا موقع نہ تھا کہ جاکی نے موت پر فتح پائی ہو۔ اُسے تین بار مُردہ قرار دیا گیا اور تجہیز و تکفین کی رسوم بھی ادا کر دی گئیں، لیکن رالف نیوس تھوڑے دنوں بعد پھر ریس کورس کو پہنچ گیا۔ وہ ڈاکٹروں کے لئے ایک معمّہ بن گیا تھا۔

رالف نیوس کسی افسانے کا ہیرو نہیں، وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ سیاست داں اس کے استقلال اور عزم سے سبق سیکھتے ہیں۔ شاعروں نے اس کے قصیدے لکھے ہیں اور آج جبکہ اس کی عمر ۴۴ سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ وہ اب بھی امریکہ کا محبوب ترین جاکی ہے۔ وہ اب تک ایک کروڑ ڈالر سے زیادہ رقم کما چکا ہے۔ گھوڑ دوڑ کے تماشائیوں کو یقین ہے کہ رالف نیوس کبھی نہیں مرے گا۔ اور اگر وہ مر بھی گیا تو قبر سے نکل کر پھر ریس کورس پہنچ جائے گا۔ اُسے دفن نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت بھی نہیں جبکہ اسے سرکاری طور پر مردہ قرار دیا جا چکا ہو۔

ایک بار سان فرانسسکو کے ممتاز ڈاکٹر ہورس والڈ نے ایک اخبار نویس کو بتایا۔ "میری ذاتی رائے ہے کہ وہ زندگی سے بے حد محبت کرتا ہے، اس قدر کہ وہ مرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔"

⁂

اسی شام رالف نیوس نے بتایا۔ "جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال کے مردہ خانے میں پایا۔ میری گردن میں شناختی کارڈ تھا۔ کسی انجانی قوت نے میرے کان میں کہا "یہاں سے بھاگو۔" میں کمرے سے باہر نکلا، ایک ٹیکسی قریب سے گزری میں نے اسے روکا اور سیدھا ریس کورس پہنچا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے تماشائیوں کے سامنے دوڑنا چاہئے تاکہ وہ جان لیں کہ میں ابھی زندہ ہوں اور ایک روز پھر گھوڑ دوڑ میں حصّہ لوں گا۔"

اس نے اپنے مرنے کے دوسرے روز پانچ دوڑیں جیتیں اور بہترین جاکی کی حیثیت سے پانچ سو ڈالر کا خاص انعام بھی حاصل کیا۔

⁂

چھ بار ڈاکٹروں نے اسے کہا کہ وہ آئندہ کبھی گھوڑے پر سوار نہ ہو سکے گا ۱۹۴۲ء میں تو اس کے لئے پہیوں والی کرسی کا انتظام کیا گیا، کیونکہ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ جاکی اب کبھی چل

پھر نہ سکے گا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی دو جگہ سے اس بری طرح کچلی گئی ہے کہ علاج ممکن نہ تھا۔ اس کے کولہوں کی ہڈیاں کئی جگہ سے چٹخ گئی تھیں۔ کھوپڑی کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ جسم کا نچلا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ کر اندر دھنس گئی تھیں۔ ۱۹۵۳ء میں ایک رگ پھٹ جانے کے باعث اس کی بصارت میں فرق آگیا تھا اور اسے ہر چیز دو دکھائی دینے لگی تھی۔ ۳۱ مئی ۱۹۶۰ء کو وہ ہالی وڈ پارک میں گھوڑ دوڑ میں حصہ لے رہا تھا کہ آخری چکر میں گھوڑے کا پاؤں آگے دوڑنے والے گھوڑے کے پچھلے پاؤں پر پڑا۔ گھوڑا گر پڑا اور رالف قلابازیاں کھاتا ہوا اتیس فٹ دور جا گرا۔ وہ کتنی ہی دیر تک چینی کی ٹوٹی ہوئی گڑیا کی طرح زمین پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ چونسٹھ ہزار تماشائیوں کے چہرے فق ہو گئے۔

اس بار اس کی موت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، اس کی بیوی اور تین بچوں کو آخری دیدار کے لئے فوراً بلا لیا گیا۔ پانچ روز بعد اس نے ہسپتال کے بستر پر آنکھ کھولی اور بیوی بچوں سے ملاقات، ایک سگریٹ اور ریڈیو کی فرمائش کی۔

آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے کہا "میں نے تم سے زیادہ سخت جان کوئی شخص نہیں دیکھا۔"

"جی ہاں —" رالف نے جواب دیا "انشاء اللہ آئندہ بھی آپ مجھے سب سے زیادہ سخت جان پائیں گے۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ماہرین نے رالف نیوس کے بارے میں اب سوچنا بند کر دیا ہے۔ اس نے حالات کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ اپنی صحت کے بارے میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اس کا عزم اس کی زندگی کا راز ہے۔

وہ تیرہ برس کی عمر میں ایک یتیم خانے سے بھاگ کھڑا ہوا، کچھ عرصہ تک وہ خیرات پر گزارہ کرتا رہا۔ لیکن آج اس کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ ہے۔ وہ دس کمروں کے ایک مکان اور ایک بڑے ہوٹل کا مالک ہے۔ وہ اب تک تین ہزار دوڑیں جیت چکا ہے۔ اس کی مالی حالت بہت اچھی ہے اور اب وہ اپنا پیشہ آسانی سے چھوڑ سکتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ اگر میں نے یہ پیشہ ترک کر دیا تو، اس سے مجھے یا میرے خاندان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ مجھے اپنے پیشے سے بڑی محبت ہے۔ میں صرف یہی کام جانتا ہوں۔ مجھے اس پیشے نے عزت بخشی ہے اور دولت بھی۔ اب رہا خطرے کا سوال، تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

رالف نیوس کس طرح موت کو چکمہ دے جاتا ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا

عقل اسے سمجھنے سے قاصر ہے، ہاں اس کا ایک پس منظر ہے۔ رالف ابھی ننھا سا بچہ تھا کہ اس کے والدین نے ازدواجی رشتہ منقطع کر کے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی۔ وہ ساتویں جماعت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ ۱۹۳۰ء کی ایک رات دیوار پھلانگ کر بھاگ نکلا۔ وہ کئی روز تک پہاڑوں میں سرگرداں رہا۔ آخر اسے چھپنے کے لئے جنگل میں ایک پرانا مکان مل گیا جو خوش قسمتی سے خالی تھا۔ قریبی گاؤں کے بچے وہاں کھیلنے آیا کرتے تھے رالف کے لئے وہ پھل اور کھانے پینے کی چیزیں لاتے۔ کئی روز بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ پولیس نے اس کی تلاش ترک کر دی ہوگی، وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور پھر کیلیفورنیا کی ایک گالف کلب میں ملازم ہو گیا۔ ننھی سی جان کے لئے گالف کھیلنے کی چھڑیوں کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ کلب کے ایک رکن کو اس پر ترس آیا اور اس نے رالف کو گھوڑوں کی تربیت دینے والے ایک ماہر کے پاس بھیجا اور اسے خط میں لکھا کہ اس بچے کو گھوڑا دوڑانے کی تربیت دو، ورنہ وہ بھوکا مر جائے گا۔

رالف کا اپنا بیان ہے کہ اصطبل میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اس سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا۔ کوئی بھی شفقت سے پیش نہ آتا۔ وہاں تعلیم و تربیت کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ اصطبل کے ملازم اکثر شراب کے نشے میں بدمست رہتے۔ ہفتے میں دو تین بار پٹنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ حالات نے رالف کو جوابی حملہ کرنے کا خوگر بنا دیا۔

۱۹۳۴ء میں اسے پہلی بار گھوڑا دوڑانے کا موقع ملا۔ اس کی تنخواہ چپراسی کی تنخواہ کے برابر تھی دوسرے سال تنخواہ میں پانچ ڈالر کا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء کی ایک شام وہ گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا تھا کہ پھاٹک اچانک بند ہو گیا۔ اور وہ نعلوں کے ایک انبار پر گر پڑا۔ اسے کئی زخم آئے۔ گھٹنے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ لیکن اس نے ہسپتال کی گاڑی میں سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ خود چل کر جاکیوں کے کمرے میں پہنچا۔ جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ایک بار ایک جج رالف نیوس کو موت کا احساس دلانے کے لئے اسے قبرستان لے گیا۔ جہاں ایک جاکی کو جو چند روز پیشتر گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا دفن کیا جانے والا تھا۔

جج نے رالف سے پوچھا "اس لاش کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟"

"وہ سویا ہوا ہے" رالف نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں رالف نیوس فوج میں بھرتی ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد ایک

حادثے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی، ڈاکٹروں نے کہا " رالف کے لئے اب چلنے پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ صرف بیٹھ سکے گا اور زندگی کے باقی ایام پہیوں والی کرسی میں گزارے گا۔ لیکن ڈاکٹروں نے یہ بات اسے نہیں بتائی، انھیں ڈر تھا کہ رالف کے اعصاب پر بُرا اثر پڑے گا۔

رالف کا سارا جسم پٹیوں سے بندھا تھا اور کمر سے نچلا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ اس حالت میں چھ ماہ گزر گئے۔

رالف ایک روز ریڈیو پر کوئی سٹیشن تلاش کر رہا تھا کہ اُسے گھوڑ دوڑ کا پروگرام سنائی دیا۔ اناؤنسر کہہ رہا تھا!

" یہ پروگرام ایک بہادر انسان کی یاد میں ہے۔ جو کچھ عرصہ پہلے زخمی ہوگیا تھا اور جس کے متعلق ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ آیندہ کبھی چل پھر نہیں سکے گا۔"

" آہ بیچارہ نہ جانے وہ کون ہے۔"

رالف نے قریبی بستر پر لیٹے ہوئے مریض سے مخاطب ہو کر کہا۔

" اس کا نام رالف نیوس ہے۔" ریڈیو اناؤنسر کہہ رہا تھا۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

فالج کا مرض اب جڑ پکڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر اس کی صحتیابی کے بارے میں مایوس ہو چکے تھے لیکن رالف کچھ اور ہی منصوبے بنا رہا تھا۔ ایک رات جبکہ ہسپتال میں مکمل خاموشی تھی، وہ بستر سے کھسکا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ رالف نے اپنے ساتھی مریضوں سے درخواست کی کہ وہ اُسے پاؤں پر کھڑا کر دیا کریں، پھر دھکیلیں اور جب وہ گرنے لگے، تو وہ اُسے سنبھال لیں۔ نوّے دن کے بعد رالف اس قابل ہوگیا کہ اپنے پاؤں پر چل کر کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا سکے، لیکن اس کی کمر کی بیٹھ ایک ناقابل حل معمہ تھی۔

رالف بستر پر لیٹے لیٹے اپنے بازو اور ٹانگیں ہلانے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی کہنیوں کے بل اپنے جسم کو اوپر اُٹھاتا۔ ہزاروں بار اس ورزش کے کرنے سے اس کے پٹھوں میں لچک پیدا ہو گئی۔

اب اُس نے پہیوں والی کرسی کا استعمال ترک کر دیا اور صرف بیساکھیوں کے سہارے چلتا۔ ڈاکٹر اور ہسپتال کا دوسرا عملہ اس کی حیرت انگیز صحت یابی پر بہت حیران تھا۔

ستمبر میں اُسے ہسپتال سے چلے جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ سیدھا ریس کورس پہنچا وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ کچھ لوگ اسے بالکل پہچان بھی نہ سکے۔

دو ماہ بعد اس نے پھر گھوڑ دوڑ میں حصہ لیا اور اس نے نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ اگلے سال اپریل تک اس کی جسمانی قوت پوری طرح بحال نہ ہو سکی تھی کہ وہ دوڑ کے دوران میں گھوڑے سے گر پڑا اور اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے میں زندگی کی دوڑ ہار گیا ہوں۔" رالف نیوس نے ایک دوست سے کہا۔ "بہرحال لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔"

چھ ماہ بعد رالف نیوس پھر گھوڑے پر سوار تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

۱۹۵۹ء میں رالف کو ہالی وڈ پارک میں ایک زبردست حادثہ پیش آیا۔ اس بار اس کے سر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ایک ٹکڑا اس کے بھیجے میں گھس گیا وہ زخموں سے چور تھا۔ ڈاکٹر اس کی صحت یابی کے بارے میں ناامید تھے۔ سرجن ابھی آپریشن کی تیاری کر رہے تھے کہ رالف کو ہوش آ گیا۔ اس نے ایک ڈاکٹر سے جو اس پر جھکا ہوا تھا. کہا

"ذرا میرے نام کے حروف الٹائیے۔"

"نیوس۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "یہ سیون (سات) بنتا ہے"

"اور سات خوش قسمت ہندسہ ہوتا ہے۔" رالف بولا۔ "میں بھی ایک خوش قسمت انسان ہوں۔"

اور یقیناً وہ ایک خوش قسمت انسان تھا۔ موت اس بار بھی اس پر فتح نہ پا سکی۔ تھوڑے دنوں بعد وہ پھر گھوڑ دوڑ کے میدان میں تھا

ترجمہ:۔ عمر شاہین علوی

انیسویں صدی کے آغاز کا ذکر ہے، جنوبی انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں ریویلو میں ایک آدمی سائی لس مارنر رہا کرتا تھا، اس کی پتھریلی جھونپڑی گاؤں کے سرے پر ایک اندھے کنویں کے پاس واقع تھی۔ جھونپڑی سے ہر وقت چرخے کی گھوں گھوں کی آواز آتی رہتی، کیوں کہ مارنر بیشتر وقت وہاں اپنے کام میں مصروف رہتا تھا۔

اس کے متعلق گاؤں بھر میں عجیب عجیب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض لوگ اسے کوئی خوفناک روح سمجھتے تھے، کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے مارنر کو مرکر زندہ ہوتے دیکھا ہے۔ دراصل ان تمام افواہوں کی وجہ مارنر کی عجیب و غریب شخصیت تھی۔

بڑی بڑی زرد خوفناک آنکھیں، اگر کسی کو گھوریں، تو وہ دہشت سے کانپ جائے، جذبات سے عاری، مرجھایا ہوا سپاٹ چہرا، کرخت آواز اور ان سب پر مستزاد اس کا گاؤں کی عام زندگی سے کٹ کر اپنے آپ میں مگن رہنا، ان سب باتوں نے اسے خاصا پُراسرار بنا دیا تھا۔

زیادہ وقت وہ اپنے کام میں مصروف رہتا۔ اگر گلی میں بچّے شور مچاتے، تو وہ باہر نکل کر ایک نظر ڈالتا، اس کی نگاہ میں اتنا غصّہ ہوتا تھا کہ بچّے ڈر کر بھاگ جاتے تھے۔

پندرہ سال سے وہ اسی طرح کی زندگی گزار رہا تھا۔ اب لوگ بھی اسے ماحول کا ایک ضروری جزو سمجھنے لگے تھے۔ مارنر کا یہ پہلو بہت دلچسپ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ اس کے ماضی سے ایک ایسی داستان وابستہ تھی جس سے بہت کم لوگ واقف تھے اور ریویلو میں تو کوئی بھی واقف نہ تھا۔

پندرہ سال قبل وہ اپنے آبائی گاؤں لنٹن یارڈ میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ ایک ہنس مُکھ اور پھرتیلا نوجوان تھا۔ وہ مذہبی تقاریب میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ انہی دنوں اس کے ایک نہایت ہی عزیز دوست ولیم نے اس سے دھوکا کیا۔ اُس نے گرجا سے ایک بڑی رقم چُرا کر مارنر پر چوری کا الزام لگا دیا۔ اس نے یہ بھی اہتمام کیا کہ جائے وقوع پر مارنر کا چاقو رکھ دیا جو برآمد کر لیا گیا۔ اسی بات کے نتیجے میں مارنر کو گاؤں سے ذلیل و خوار ہو کر نکلنا پڑا۔ اس ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ مارنر کو اپنی منگیتر سارا سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ان سب باتوں نے اسے اتنا پژمردہ کر دیا کہ اس نے ماضی سے رشتہ کلیتہً منقطع کر لیا اور ریویلو میں اس نے ایک دوسرے ہی انداز کی زندگی شروع کر دی۔

ریویلو ایک خوشحال گاؤں تھا۔ یہاں کی مٹی سونا اُگلتی تھی، ہر طرف سرسبز و شاداب باغ، گندم سے بھرے کھلیان اور اونچی اونچی حویلیاں نظر آتی تھیں۔ یہاں مارنر کا کاروبار خوب چمکا، ریشمی کپڑا بنانے میں اس کا جواب نہ تھا اور ریویلو میں ایسے فن کے قدرداں خاصے تھے۔ وہ سارا دن کام کرتا اور چرخے کا قرب اُسے سکون بخشتا۔ وہ اس کا ساتھی بن گیا تھا، جو ماضی کو فراموش کرنے میں مدد دیتا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ اپنی کمائی خیرات کر دیتا تھا لیکن ریویلو میں آکر جب اس نے بہت مشقت کے بعد پہلی بار سونے کے چند "سکے" کمائے تو، اسے ان سے محبت ہو گئی۔ اس کے بعد وہ سونا کمانے کے شوق میں ایسا غرق ہوا کہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ اب اسے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ موم بتی کی روشنی میں وہ سونے کے ڈھیر کو جی بھر کر دیکھتا اور پھر اُسے زمین میں دفن کر دیتا۔ اسی طرح اس کی زندگی کے پندرہ سال اور گزر گئے۔

ریویلو میں سب سے بڑا زمیندار "کاس" تھا۔ وہ گاؤں کے سب سے بڑے مکان "لال حویلی" میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی عرصہ ہوا مر چکی تھی اور حویلی کا سارا انتظام نوکروں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کی حویلی کی فضا میں شفیق ماں یا وفا شعار بیوی کی کمی بُری طرح محسوس ہوتی تھی۔ کاس خود بڑا سخت گیر تھا۔ لیکن تھا بڑا بے پروا۔ ایک طرف وہ اتنا سخت مزاج تھا کہ اپنے لڑکوں کو بھی اپنے انتظام میں شریک نہ کرتا اور دوسری طرف اتنا بے پروا کہ مزارعوں پر لگان کی رقم چڑھتی رہتی اور اسے وصول کرنے کی فکر نہ ہوتی۔

اس کے دو بڑے لڑکے ڈنستان اور گاڈفرے عجیب طبیعتوں کے مالک تھے۔ گاڈفرے جو سب میں بڑا تھا، یوں تو نہایت خوبصورت، خوش خرام اور نیک تھا، لیکن کچھ برسوں سے وہ بہت متفکر سا رہنے لگا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہے۔ دراصل گاڈفرے نے خفیہ طور پر ایک عورت مالی سے شادی کر لی تھی اور اس سے ایک لڑکی بھی پیدا ہو چکی تھی، لیکن مالی افیون کھانے لگی تھی، جس کی وجہ سے گاڈفرے اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ یہ بات کسی کو وہ بتا بھی نہیں

سکتا تھا، کیونکہ اس طرح اس کے باپ کو اس شادی کی خبر ہو جاتی اور گاڈفرے کو گھر سے نکلنا پڑتا۔ اب وہ نینسی لیمٹر کو دل وجان سے چاہنے لگا تھا۔ نینسی واقعی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اگر وہ لال حویلی میں آجاتی تو گھر کی کایا پلٹ دیتی، لیکن گاڈفرے کے پاؤں میں ایسی بیڑیاں پڑی تھیں کہ وہ نہ تو اپنا راز کسی کو بتا سکتا تھا اور نہ نینسی سے شادی کر سکتا تھا۔ اس پر مزید بدقسمتی یہ کہ اس کے چھوٹے بھائی ڈنسٹان کو اس کے راز کا علم ہو گیا تھا۔ ڈنسٹان بڑا عیار اور آوارہ مزاج لڑکا تھا۔ وہ بہت بڑا جواری تھا اور ہر وقت کوڑی کوڑی کا محتاج رہتا۔ وہ گاڈفرے کو افشائے راز کی دھمکی دے کر خوب لوٹتا۔ آج بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ گاڈفرے نے قرض لے کر ڈنسٹان کو کچھ رقم دی تھی، اب قرض کی واپسی کا معاملہ تھا۔ اس نے ڈنسٹان سے بہت عاجزی سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا

"تم جانتے ہو آج کل ڈیڈی کو خود پیسوں کی ضرورت ہے، اگر تم رقم نہ دو گے اور ڈیڈی کو پتہ چل گیا کہ میں نے قرض لے رکھا ہے، تو وہ بہت خفا ہوں گے۔"

ڈنسٹان کو ان باتوں کی کیا پروا تھی، اس نے گاڈفرے سے کہا کہ وہ اپنا گھوڑا بیچ کر رقم چکائے۔ گاڈفرے کو اپنا گھوڑا "وائلڈ فائر" بہت عزیز تھا۔ وہ اس کو بیچنا نہیں چاہتا تھا، لیکن مجبوری کے تحت اُسے گھوڑا ڈنسٹان کے حوالے کر دینا پڑا۔

وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ابھی گاؤں سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے مارنر کی جھونپڑی دکھائی دی۔ جھونپڑی پر نظر پڑتے ہی اُسے کچھ خیال آیا اور وہ رک گیا۔ اس نے اپنے دوستوں سے مارنر کی دولت کے قصّے سُنے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مارنر کو ڈرا دھمکا کر اس سے کچھ رقم ہتھیالی جائے۔ اس کے قدم جھونپڑی کی طرف اُٹھنے لگے۔

جھونپڑی میں آگ جل رہی تھی اور اس پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھن رہا تھا۔ ڈنسٹان چوروں کی طرح چپ چاپ آکر بیٹھ گیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسے ایک جگہ کچھ تازہ ریت جمی ہوئی نظر آئی اور وہ ریت کھودنے لگا۔ ریت ہٹاتے ہی اسے چمڑے کا ایک تھیلا نظر آیا۔ وہ سونے سے بھرا ہوا تھا۔ ڈنسٹان نے تھیلا اُٹھا لیا، ریت برابر کر دی اور گھوڑے پر سوار ہو کر چمپت ہوا۔

جب ڈنسٹان جھونپڑے سے نکل رہا، اُسی وقت مارنر تیز تیز قدم اُٹھاتے کہیں سے واپس آرہا تھا۔ وہ عموماً رات کے کھانے کے بعد سونے سے کھیلنے کا عادی تھا۔ وہ اسی کھیل کے تصوّر میں مست چلا آرہا تھا۔ جھونپڑی میں آتے ہی اس نے گوشت آگ پر سے اُٹھایا، اُسے پلیٹ میں نکالا اور کھانے کا ارادہ کیا، لیکن آج اس کا شوق زر بہت فراواں تھا۔ اس نے سوچا کہ کھانے کے ساتھ ساتھ سونے سے کھیلنا زیادہ لطف دے گا۔ وہ اپنے خزانے کی طرف بڑھا، ریت اسی طرح جمی ہوئی تھی، جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے خوشی خوشی ریت ہٹائی اور اندر ہاتھ ڈالا، لیکن اس کا ہاتھ خالی زمین سے ٹکرایا، تھیلے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ دیوانوں کی طرح ہر چیز الٹنے لگا۔ کافی دیر بعد جب اس

کا ذہنی توازن درست ہوا، تو اس نے سوچا کہ اس حادثے کی اطلاع زمیندار کو دینا بہت ضروری ہے۔ وہ چور کا پتہ لگائے گا۔ وہ مسٹر اوس گڈ کی طرف روانہ ہو گیا، کیوں کہ آج اوس گڈ کے یہاں ایک دعوت تھی اور زمیندار کا وہاں آنا ضروری تھا۔

مسٹر اوس گڈ کی پارٹی میں زمیندار نہیں آیا، تاہم مارنر نے سارا واقعہ اہلِ محفل کو کہہ سنایا۔ زیادہ تر لوگوں نے یہی کہا کہ وہ خود ہی رقم کہیں بھول آیا ہے۔ مارنر کو بھی یہی شبہ ہوا کہ دافعی میں خود ہی رقم کہیں بھول آیا ہوں، مگر چوری کی خبر اب پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگوں نے قیاس آرائیاں شروع کر دیں، لیکن کسی کا خیال ڈنستان کی طرف نہ گیا۔ ایک دن گاڈفرے نے اڑتی اڑتی یہ خبر سنی کہ ڈنستان ایک جگہ دیکھا گیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔

کچھ دنوں تک ڈنستان کا انتظار رہا، لیکن جب وہ واپس نہ آیا، تو لوگوں کو اطمینان ہو گیا کہ شاید وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔ چند ماہ بعد نئے سال کی تقریب آئی۔ اس دفعہ حسبِ معمول زمیندار کاس نے ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ ریویلو کے تمام متمول اور خوش حال باشندے اس میں مدعو تھے۔ حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ گاڈفرے کو اس دن نینسی کے ساتھ رقص کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ دونوں دیر تک رقص کرتے رہے۔ لیکن عین اس وقت جب یہ جشن جاری تھا، گاڈفرے کی افیوں خور بیوی ریویلو کی طرف قدم اٹھا رہی تھی۔ دراصل گاڈفرے نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ وہ غصّے میں بھری صبح سویرے گھر سے نکل پڑی تھی اور چند گھنٹوں میں ریویلو کے قریب پہنچ گئی، لیکن اب وہ کافی تھک چکی تھی۔ بالآخر اسے نیند آنے لگی اور وہ مارنر کی جھونپڑی سے چند گز دور ایک جگہ بیٹھ گئی۔ رفتہ رفتہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ مست ہو کر سو گئی۔ بچّی اس کے ہاتھ سے نکل کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی مارنر کی جھونپڑی کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اسے دور سے جلتی ہوئی آگ اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ وہ اندر داخل ہو گئی اور وہیں مارنر کے کوٹ پر لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے بھی نیند نے آ لیا۔

چند منٹ بعد مارنر جھونپڑی میں داخل ہوا۔ وہ آج اپنی رقم کے سوگ میں تھا اور بہت ہی فکرمند حالت میں اندر داخل ہوا۔ لیکن فرش پر نظر پڑتے ہی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ تاریک کمرے میں فرش پر کوئی چیز سونے کی طرح چمکتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور اسے اٹھانے لگا، لیکن سخت سکوں کے بجائے اس کے ہاتھ کسی نرم ریشمی چیز سے ٹکرائے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو اسے ایک دو سال کی صحت مند بچّی سوتی نظر آئی۔ وہ بچّی کے سنہرے بالوں کو سونے کا ڈھیر سمجھ بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ اداس ہو گیا، لیکن اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اسے اپنی ننھی سی بہن یاد آ گئی جو لنٹرن یارڈ کے قبرستان میں دفن تھی۔ اس نے بچّی کو گود میں لے لیا اور باہر نکل کر اس کے قدموں کے نشان تلاش کرنے لگا۔ جھونپڑی کے باہر برف پر بچّی کے ننھے

ننھے پیروں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور تھوڑی سی دیر میں مالی کے پاس کھڑا تھا۔ مالی کا جسم سردی سے اکڑ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ مارنر فوراً سمجھ گیا کہ بچّی کی بدنصیب ماں یہی ہے۔ وہ فوراً کاس کی حویلی کی طرف دوڑا، تاکہ کسی ڈاکٹر کو بلا کر اس عورت کی جان بچائی جائے۔

حویلی میں گاڈفرے ابھی ابھی رقص سے فارغ ہوا تھا۔ اس نے جونہی اپنی بچّی کو مارنر کی گود میں دیکھا وہ بوکھلا گیا، لیکن جب مارنر نے ہانپتے کانپتے ساری بات سُنائی، تو اس کے دل میں نہایت ہی گھٹیا خواہش پیدا ہوئی۔

"خدا کرے اس کم بخت کا دم جلد نکل جائے اگر ڈاکٹروں نے اسے بچالیا، تو بہت بُرا ہوگا۔"
اتنی دیر میں کافی لوگ مارنر کی بات سُن کر مالی کی مدد کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ گاڈفرے بھی مجبوراً ان کے ساتھ ہو لیا۔

ڈاکٹر نے مالی کی نبض دیکھی، وہ مر چکی تھی، گاڈفرے کے ہونٹوں پر نہایت ہی مکروہ تبسّم پھیل گیا لیکن اس کے دل اور اس مکروہ تبسّم کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اب وہ بہت خوش تھا۔

دوسرے دن مالی دفن کر دی گئی۔ اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی وہ مارنر کے پاس آگئی۔ دعوت کا ہنگامہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب صرف لاوارث بچّی کا مسئلہ رہ گیا تھا، لیکن مارنر کے دل میں بچّی کے لئے اتنی محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کہ اس نے خود ہی بچّی کی پرورش کی ذمے داری لے لی۔ یہ بچّی اس کی زندگی کا ایک حصّہ بن گئی تھی جس کے بغیر اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

مارنر بچّی کا باپ بن گیا اور مسز ونتھراپ نے ماں کی شفقتیں بچّی کے لئے وقف کر دیں۔ اس کا نام مارنر کی مرحوم بہن کے نام پر ایپی رکھا گیا۔

اب مارنر ایپی کے سہارے زندہ تھا۔ ایپی کے لئے اب سارے گاؤں سے اس نے اپنا تعلق جوڑ لیا تھا۔ گاؤں والے اس بچّی میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔

اسی طرح سولہ سال اور گزر گئے۔ مارنر پچپن، ساٹھ برس کا بوڑھا ہو گیا اور ایپی اٹھارہ سال کی الھڑ دوشیزہ، ریویلو کے حالات میں اس قدر تبدیلی آئی کہ زمیندار اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور اس کے بعد گارڈفرے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔

سولہ سال کے عرصے میں گارڈفرے ایک سنجیدہ آدمی بن گیا تھا اور اب سارا ریویلو اس کی عزت کرتا تھا۔ لیکن گارڈفرے اور اس کی بیوی کو ایک غم کھائے جا رہا تھا۔ یہ غم اولاد کا غم تھا۔ نینسی کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ کمی اسے ہر لحظہ افسردہ اور پژمردہ رکھتی تھی۔

گاڈفرے کو بھی یہی غم تھا، لیکن وہ اپنی پہلی اولاد ایپی کو دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا اور مارنر کی مدد کرتا رہتا تاکہ ایپی کو تکلیف نہ پہنچ سکے۔ وہ کافی دنوں سے نینسی سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ لوگ ایپی کو گود لے لیں۔ لیکن نینسی اس کی مخالفت کرتی اور کہتی۔۔

"ایپی جس زندگی کی بچپن سے عادی ہے، اسے وہی راس آئے گی۔ وہ ہمارے یہاں آ کر خوش رہ سکے گی اور مارنر کو بھی بڑا دکھ پہنچے گا۔"

ادھر ایپی مسز ونتھراپ کے لڑکے 'آرن' سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔
نینسی نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری ایپی ملکہ کی طرح زندگی بسر کرے۔ ہم اس کی کسی اچھی جگہ شادی کریں گے"
"میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔" مارنر کا منہ کھلا ہوا تھا۔

"بات یہ ہے کہ ہم ایپی کو گود لینا چاہتے ہیں۔ اب تک اس کی پرورش کی ذمہ داری تم نے اٹھائی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اب یہ ذمہ داری ہمیں لے لینی چاہئے تاکہ ایپی ایک اچھی زندگی بسر کر سکے۔ آخر تم کب تک محنت کرتے رہو گے، تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

مارنر کا چہرا سفید پڑ گیا۔ وہ ایپی سے بہت ہی محبت کرتا تھا، تاہم اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"یہ آپ ایپی سے دریافت کر لیں کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہے۔" ایپی مارنر سے لپٹ گئی اور معصومانہ جذبات سے بے قابو ہو کر بولی:

"نہیں ابا، میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنا نہیں چاہتی۔ مجھے اس کمرے سے بے حد پیار ہے۔ میں یہیں رہوں گی، مجھے ملکہ بننا ہرگز پسند نہیں۔"
"لیکن میں تمہارا باپ ہوں" گاڈفرے نے گلوگیر آواز میں کہا۔
ایپی کے بجائے مارنر نے جواب دیا:

"لیکن جناب، اس وقت آپ کی پدری شفقت کہاں سو رہی تھی جب میں نے اس دو برس کی جان کو سینے سے لگایا تھا۔ اس وقت آپ کی محبت کو کیا ہو گیا تھا جب یہ بچی بے آسرا رہ گئی تھی۔"

مارنر کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس کی نگاہیں بار بار ایپی پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے سانس میں بے پناہ محبت کی ناتمام داستان تھی۔ اِدھر گاڈفرے جذبات کے گرداب میں تھا۔ بچی کو دیکھ کر اس کی پدری محبت میں تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے مارنر کے جذبات کا احترام کیا اور دکھ بھرے لہجے میں کہا:

"اچھا ایپی، جہاں بھی رہے خوش رہے میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی گاڈفرے وہاں سے چل دیا۔ نینسی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ راستے بھر دونوں بہت اداس رہے، لیکن وہ سمجھ چکے تھے کہ اصرار فضول ہے، غلطی خود گاڈفرے کی تھی۔ مارنر پر اس واقعے کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ اس کی بیٹی کا ایک اور حقدار پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس کے پاس اس بیٹی کے علاوہ رہ بھی کیا گیا تھا، چنانچہ اسی ادھیڑ بن اور کشمکش میں اسے اپنا وطن یاد آیا۔ پھر ایک دن

سولہ سال کے بعد ٹھیک نئے سال کی تقریب کے موقعے پر مسز وِنتھراپ، آرن، مارنر اور ایپی جھونپڑی میں بیٹھے تھے۔ ایپی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی، چنانچہ وہ سب پھولوں کی باتیں کر رہے تھے۔ آرن نے تجویز پیش کی کہ جھونپڑی کے سامنے ایک باغیچہ لگایا جائے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کر ہی رہے تھے کہ مارنر کی جھونپڑی کے قریب جو اندھا کنواں تھا، اس کا ذکر چل نکلا۔ ایپی نے بتایا کہ کنویں کی تہ میں جو تھوڑا بہت پانی تھا وہ بھی خشک ہونے لگا ہے۔

یہ باتیں کرتے کرتے وہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد مارنر اپنی بیٹی کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ ایپی کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے مارنر سے کہا:

"ابا، جب میری شادی ہوگی تو میں وہ انگوٹھی پہنوں گی، جو امّی کی انگلی سے نکلی تھی۔"

"لیکن تم شادی کرو گی کس کے ساتھ۔؟" مارنر نے شفقت آمیز لہجے میں پوچھا:

"میں آرن کے ساتھ شادی کروں گی۔"

مارنر نے اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ عین اس وقت جب ایپی اور مارنر آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے، قدرت کی طرف سے ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

اندھا کنواں بالکل خشک ہو گیا تھا اور اس کی تہ سے ایک سڑی ہوئی لاش برآمد ہوئی۔ یہ لاش ڈنسٹان کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گاڈفرے کا سنہری چابک تھا۔ یہ چابک اس نے چرا کر قبضے میں کر لیا تھا اور وہ اسی سے پہچانا گیا، لیکن ان سب سے اہم چیز اس کے پاس مارنر کی چرائی ہوئی رقم تھی۔

وہ رقم مارنر کو لوٹا دی گئی اور ڈنسٹان کی ہڈیاں دفن کر دی گئیں۔ گاڈفرے پر اس کا عجیب اثر ہوا، اس نے سوچا:

"قدرت کتنی انصاف پسند ہے، ہر شخص کے راز ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مجھے بھی اب اپنے راز کو ظاہر کر دینا چاہیے۔"

چنانچہ ایک دن اس نے نینسی کو ساری بات کہہ سنائی۔ نینسی یہ سب کچھ جان کر بہت افسردہ ہو گئی۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئی اور ان دونوں نے مارنر کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جس وقت وہ دونوں مارنر کی جھونپڑی میں پہنچے، مارنر ایپی سے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا، یکایک دروازہ کھلا اور نینسی اور گاڈفرے اندر داخل ہوئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد گاڈفرے نے اپنا مدعا بیان کرنا شروع کیا:۔

"بھائی مارنر، مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں نقصان پہنچانے والا میرا اپنا بھائی تھا۔ میں اس کی طرف سے تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔" اس کے بعد گاڈفرے کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ سلسلۂ کلام کس طرح جاری رکھے۔

وہ ایپی کو لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسے تمام راستے وہ گرجا یاد آتا رہا جس سے اسے عقیدت تھی اور جہاں اس کی زندگی کا نیا موڑ شروع ہوا تھا، لیکن جب وہ وطن پہنچا، تو لنٹن یارڈ صنعتی انقلاب زد میں آچکا تھا۔ نہ گرجا باقی تھا، نہ مکانات، بلکہ ان کی جگہ دیو ہیکل کارخانے قائم تھے۔ انھیں ان کارخانوں سے کیا روحانی سکون مل سکتا تھا۔ وہ وہاں سے واپس آگیا۔ واپس آکر اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اُس نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ حال کی مسرتوں سے مستقبل کی خوشیوں کے جھرنے پھوٹتے ہیں اور اس نے ڈنتھراپ کے خاندان کے ساتھ گھل مل کر یکجا رہنے کا ارادہ کرلیا۔

موسم بہار میں جب شادیوں کا موسم آیا، ایپی سفید لباس میں ملبوس آرن کے پہلو میں کھڑی تھی۔

ریویلو کی پوری آبادی گرجا گھر میں جمع ہوئی اور سب مارنر کی شفقت اور اس کے عزم اور حوصلے کی تعریف کر رہے تھے۔

جب ایجاب و قبول کی رسم ادا ہوگئی، تو مارنر نے آرن سے کہا:

"لو اب میں اپنی بیٹی کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

ایپی نے فوراً کہا:

"نہیں، ابا! آپ نے آرن کو بھی اپنی اولاد بنا لیا ہے۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

چند روز بعد ایپی، آرن، مسز ونتھراپ اور مارنر اس نئے مکان میں بیٹھے تھے جو گاڈفرے نے ان کے لئے تیار کرایا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک بڑا باغ تھا، جس میں پھول بہار دکھا رہے تھے۔

"پیارے ابا" ایپی نے مارنر کی آغوش میں گرتے ہوئے کہا، "ہمارا گھر کتنا خوبصورت ہے! ہم کتنے خوش نصیب ہیں!"

مارنر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ڈھلکنے لگے۔ وہ بے پایاں مسرت کے احساس سے بے خود ہوگیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی کے ویرانے میں چپکے سے بہار آگئی ہے اور اس کے دل کا کنول کھل گیا ہے۔

••

نادر کتب

نکاتِ مجنوں

مجنوں گورکھپوری

تنقیدی حاشیے اور کچھ نئے مضامین 5/-

تحقیق و تنقید

کچھ نئے مضامین اور "تنقید جدید" اور "تحقیق و تنقید" کے بیشتر مضامین کا یکجا ایڈیشن۔ اختر اورینوی

3/75

تنقید و تجزیہ

اردو میں قصیدہ نگاری کے بعد دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ ابو محمد سحر 3/-

نئے ادبی رجحانات !

ترمیم شدہ پانچواں ایڈیشن جس میں اس بار دو نئے مضامین "پیروڈی اور رپوتاژ" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین 3/-

ضدی

عصمت کا مشہور ناولٹ جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔

عصمت چغتائی 2/50

چار دل چار راہیں

خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔

خواجہ احمد عباس 3/50

گاندھی نامہ

چار جلدوں پر مشتمل کلیاتِ اکبر کے بعد یہ پانچواں مجموعہ

اکبر الہ آبادی 2/50

کتابستان الہ آباد ۲

جمیلہ ہاشمی

یہ پچھلی رات کا چاند بادلوں کے جھروکوں سے جھانکتا ہوا بھاگا جاتا ہے اور ہوا میں پانی کی بوندوں کی جھنکار سی ہے درختوں پر نکلی نئی کونپلوں کی باس پھولوں کی سوگندھ کے ساتھ ملی میرے آس پاس ڈول رہی ہے۔ دور باغ کے کسی کونے میں کوئل رہ رہ کر یوں بولتی ہے جیسے میرے من میں درد کی لہریں ہولے ہولے اٹھتی ہیں۔ نیچی دیوار سے پرلی طرف میرے بھیا کے پوتوں میں سے کوئی جاگ اٹھا ہے اور بناد کے چلائے جاتا ہے۔ میں چونک کر اٹھتی ہوں یہ کہیں میری منی تو نہیں مگر پدمنی کہاں جب بھی گھر میں کوئی بچہ روتا ہے رات کو ڈر کر چیختا ہے ماں کو پکارتا ہے۔ مجھے پدمنی یاد آتی ہے۔ پدمنی تو اب یوں لگتا ہے پچھلے جنم کی میری بیٹی تھی۔ اس جنم میں آنکھ کھول کر مجھے وہی یاد آتی ہے اور اس کے ساتھ پرانے دکھ یوں جاگ اٹھے ہیں جیسے برسات کے جھرنوں سے سوکھی کھیتیاں ہری ہو جاتی ہیں۔ میں کانوں میں انگلیاں دیتی ہوں۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند کو دیکھتی ہوں۔ اندھیرے میں بھگوان کا دھیان کرتی ہوں۔ مگر من بڑا ہٹیلا ہے بالک کی طرح اسے جیسے جیسے روکو ویسے ویسے مچلتا ہے۔ بھلا اس سے کون پوچھے پرانے دنوں میں کیا رکھا ہے۔؟

میرے پاس سوئی مالتی نے بھی کروٹ بدلی ہے ابھی وہ کہے گی " ماں جی پوجا کا سمے تو ہو گیا ہے پھر میں یادوں کے بوجھ تلے دبی بھاری قدموں سے اٹھوں گی اور اشنان کروں گی باس سے تھکے پھولوں کو تھال میں سجاؤں گی اور سنگ مرمر کی سفید سیڑھیوں کو چوموں گی جبکہ میرا من اس ساری پوجا میں نہیں ہو گا۔ میرے بھیگے بالوں سے گرتے قطرے میرے پیچھے دیئے کی روشنی میں ستاروں کی جوت کی طرح لگیں گی اور میں ادم کے اس مندر میں یوں گر جاؤں گی جیسے کوئی مہاتما سمادھی لگائے زمانوں سے بیٹھا ہو۔ مالتی ست رام جپتی ہر ایک

کو بتاتی ہے کہ میں پوجا میں رات دن کیسے مگن رہتی ہوں دل کی باتیں دوسروں کو کہاں معلوم ہو پاتی ہیں۔

میں اوم کے اس مندر میں پھولوں کی سوگندھ سے گھری بھجن گاتی ہر سمے ان پرانے دنوں میں جا بستی ہوں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے جب بیتا سمے کبھی لوٹ کر نہیں آ سکتا تو بھلا من ایسی بیکار کی آشاؤں میں کیوں الجھا رہتا ہے؟ بھگوان جو شکتی دیتا ہے دکھوں کو سہنے کی طاقت دیتا ہے شانتی کیوں نہیں دے سکتا۔ کبھی کوئی مہاتما ادھر آ نکلتے ہیں تو پجاری جی ان سے میرا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ مجھے اشیرباد دیتے آئے ہوئے سادھو مہاتماؤں سے میں آج تک یہ نہیں پوچھ پائی کہ تم لوگ جو مکتی کا پرچار کرتے ہو یہ بیکار کی باتیں رہنے کیوں نہیں دیتے مجھے مکتی کی آشا نہیں ہے۔ گیلی لکڑی کی طرح میں سدا سلگتی رہی ہوں اور انت تک میں یونہی سلگتی رہوں گی۔ میرا من پاتال کی طرح گہرا ہے اس کی اتھاہ نہ مجھے ملی ہے اور نہ تمہیں ملے گی۔ یہ بھلا مکتی سے بھر سکے گا۔ میں ناستک نہیں ہوں پر تمہارے بول مجھے تسلی نہیں دے سکتے۔ لوگ کہتے ہیں وقت بڑے بڑے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ پر میرے ننگے زخموں پر تو کوئی شے بھی مرہم نہ بن سکی۔

مالتی جانتی ہے میرے بنا کہے جانتی ہے کہ مجھے مکتی کی آشا نہیں پر زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ کبھی کبھی جب راتوں کو اندھیکار گہرا ہو جاتا ہے اور اسے بھی نیند نہیں آتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور آپ ہی آپ کہنے لگتی ہے "کیوں ماں جی پوجا سے بھگوان نہ ملے پر شانتی تو ملتی ہے۔" اور میں یہ بات سنکر چپ رہتی ہوں۔ میں اسے کیا کہوں کہ کچھ بھی نہیں مل پاتا۔ کبھی کبھی نہیں مل سکتا۔ آدمی کے حصے میں صرف سلگنا آیا ہے۔

دھرتی کی طرح میں نے پدمنی کو جنم دیا تھا اور بھگوان نے جب مجھ سے اسے بھی لے لیا۔ اسے زندگی ہی میں مجھ سے الگ کر دیا تو میں اور کس سے کی آشا کروں۔ پجاری جی کی باتیں سنکر اوم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پراتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

ندی کا دھارا اسی طرح رواں ہے، وہ پتھر بھی اسی طرح ہے صرف میں بدل گئی ہوں چیزوں کے مقابلے میں آدمی کی زندگی کتنی کم ہوتی ہے۔ پیپل کا درخت ویسے ہی ندی پر جھکا ہوا ہے جیسے ان گنت صدیوں پہلے جھکا ہوا تھا۔ بیتا وقت مجھے تو اتنا ہی لمبا لگتا ہے جیسے اس کے اور میرے درمیان صدیاں ہوں زمانے ہوں اور کتنے ہی جنم ہوں۔ یہ جنموں پہلے کی بات لگتی ہے جب شام کے سائے ندی کی لہروں لہروں میں رنگ بنکر بہہ رہے تھے میں کھیتوں سے آتے ہوئے راہ میں تھک کر پتھر پر ٹک کر بیٹھ گئی تھی اور تھکن کو دھونے کے لئے پاؤں پانی میں ڈال لئے تھے۔ ساتھ کی سکھیاں آگے نکل گئیں اور آواز دیتے دیتے سرکنڈوں کے بنے ہوئے راہ سے دوسری طرف چھپ گئیں مجھے ان کی باتوں اور قہقہوں کی گونج کا دور تک سنائی دیتی رہی پھر بسنتی نے زور سے کہا "ہم جا رہی ہیں تو اکیلی کہیں گم نہ ہو جائیو۔"

"بسنتی کو کیا معلوم تھا گم ہونے کے لئے اکیلے ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

پھر پل کے پار سے شام کے دھندلکے میں ایک سوار آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا تھا کیا "شام نگر" کو راستہ یہیں سے مڑتا ہے؟ وہ پیپل کے پتوں کے بھیگے ہوئے گہرے سائے اور ندی کے رنگین پانی کے مقابلے میں مجھ سے بہت اونچا اور دور ایک دیو سا لگ رہا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور اس کی پلکوں پر دھول کی سفیدی بڑی بھلی لگتی تھی وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہا تھا اور اس کی کیسری پگڑی سے اس کے کان ڈھپے ہوئے تھے اس کے کانوں میں لٹکے بالے بات کرتے میں ہل رہے تھے۔

میں نے کہا تھا پل کے پار والے شام نگر میں جاؤ گے یا ادھر والے "شام نگر" میں اور ہاتھ اٹھا کر دور اٹھتے نیلے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میرے بھیگے ہاتھ سے بوندیں میری باہنہ پر پھیلتی جا رہی تھیں اور ایک عجیب بے چینی میری جان کے ساتھ لپٹی جا رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر پچھلے پل کے اس پار والے شام نگر کو دیکھا تھا پھر میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں دوسرے شام نگر کی طرف اس راہ پر جہاں میری سکھیاں ہنستی گاتی چلی گئی تھیں اور جہاں سے اٹھتے نیلے دھوئیں کی دھاریاں ہولے ہولے آکاش سے اترتے اندھیرے کی نیلاہٹ میں گم ہو رہی تھیں اس نے ایک لمحہ بھرپور نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اور پھر بنا کچھ کہے اپنا گھوڑا اسی راہ پر ڈال دیا تھا جو میرے گاؤں کو جاتی تھی۔"

لوگ چارے کے گٹھے اٹھائے اپنے جانوروں کے ساتھ آ رہے تھے اور شام کے سنّاٹے میں جو درختوں کھیتوں اور دھرتی کے سینے سے اٹھتا ہے۔ گھنٹیوں کی ٹھنٹناہٹیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ پچھم کی طرف سورج بادلوں کے پیچھے ہاتھ سے پھسلے گولے کی طرح نیچے ہی نیچے ڈھلکتا جاتا تھا اور دوسرے گاؤں کی طرف جاتی عورتیں تیز تیز قدم اٹھائے اپنے بوجھ سنبھالے بھاگتی جان پڑتی تھیں۔ ان کے پیچھے کھیتوں کی منڈیروں پر گرتے پڑتے بچے روتے جاتے تھے اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ایک گھڑی ان سب سے الگ ہوں۔ مجھے کہیں نہیں جانا اور جب شام رات کے گلے ملے گی تو میں بھی اس سرخی کے ساتھ اوپر اٹھ کر گم ہو جاؤں گی۔ پرندوں کی پروں کی تیزی سما جاؤں گی۔ میرا خون رگوں میں گرم جلتا ہوا مجھے کسی اور کا بوجھ معلوم پڑتا تھا۔ سکھیاں اور ان کے پیارے گیت مجھے بہت پرانی کہانی کی طرح لگے جس کا بس ایک آدھ بول ہی بھولا بسرا سا میرے ذہن میں باقی رہا ہو۔ جانے پہچانے راہوں کی دھول مجھے قدموں کے نیچے آج بڑی بیگانی لگ رہی تھی۔ مندر میں شام کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور گاؤں کے دوسرے کنارے میرا گھر مجھے میلوں دور دکھائی دیتا تھا۔ گائے بھینسوں کو ہانکتے ہوئے لڑکے گاتے آتے تھے مجھے وہ آوازیں بھی عجیب لگیں جیسے جاگ کر پہلی بار انھیں سنا ہو۔ میرے سارے جسم میں ایک کپکپی تھی شاید دیر تک پاؤں ندی میں لٹکائے رہنے کی وجہ سے سردی کی لہریں میری رگوں میں چلنے لگی تھیں۔ شاید میرا من تب پہلی بار جاگا تھا۔ ایسا ہی ہوگا ورنہ جس گاؤں کی دھرتی نے مجھے جنم دیا جو مجھ میں

رچی ہوئی تھی وہ بھلا بیگانی کیوں لگتی۔

ماں نے دیکھا تو پھٹکارنے کے لئے کہنے لگی کیا تیرے کھیلنے کے دن باقی ہیں جو تو کھیت سے گھر تک آتے آتے جنم لگا دیتی ہے۔ اور گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔

میں نے ایسی آواز میں جو مجھے کسی اور کی لگی تھی کہا تھا۔" کیوں ماں آنند پور سے کوئی آیا ہے "؟ ماں نے کہا تھا " یہ سب باتیں پوچھ لینا کام تو پہلے نمٹا لے "۔ پھر میرا چھوٹا بھائی رونے لگا اور ماں نے بہت غصے سے میری طرف دیکھ کر " اب کھڑی کھڑی کیا سپنے دیکھ رہی ہے کیا اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ذرا بھیا کو بہلا لے اتنے میں روٹی ڈال لوں۔

بھیاّ کو اٹھا کر میں باہر جانے کے لئے مڑی ہوں تو ماں نے پھر کہا " اری چمپا کیا تیری مت ماری گئی ہے۔ ایسے سمے بھلا کوئی جوان لڑکی باہر نکلتی ہے جا کوٹھڑی میں جا مر۔ گھر کا کام میں خود دیکھ لوں گی۔

آج جانے کیا بات تھی میں بدل گئی تھی کہ ماں کو غصہ زیادہ تھا۔ بھیا کو لے کر آنگن میں ٹہلتے ہوئے میں نے اپنی رگوں میں آگ سی بہتی پائی جیسے میں راون کا بت ہوں جسے میلے کے دن جلایا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی چنگاری نہ تھی۔ یہ آگ کیسی تھی۔؟

پچھم کی طرف بادلوں میں لگی آگ ہولے ہولے ہواؤں میں گھل گئی اندھیرا آکاش سے نیچے اتر آیا اور کھیلنے والے لڑکوں کی طرح ایک ایک کر کے تارے اپنے گھروں سے نکل کر مانو میدان میں اکٹھے ہونے لگے۔ میرے کندھے سے لگا لگا بھیاّ جانے کب کا سو چکا تھا۔

ماں کے پکارنے پر میں نے جب اوپر دیکھا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے نیند میں کسی کو دیکھ رہی ہوں۔ بھیا کو لٹا کر میں چور سی بیچ آنگن کے کھڑی ہو گئی۔ آج میرے ہاتھ پاؤں میرے بس میں نہ تھے خیالوں کا دھارا جانے مجھے کہاں بہائے لئے جاتا تھا جیسے میں بھی ایک تنکا ہوں جو ندی کی لہروں میں آگے ہی آگے پانی کے ساتھ چلا جاتا ہے اور پھر پیپل کی چھاؤں اور ندی کے رنگین دھارے کے بیچ گھڑ سوار جانے کیوں گھڑی گھڑی میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا آخر وہ میرا کون تھا۔؟

پھر شام اور گہری ہو گئی بھیاّ سو گیا بابا مہمان کے لئے کھانا حویلی ہی میں لے گیا میں اور ماں گلی کی عورتوں کے ساتھ گاؤں کے باہر چلے۔ میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں آج چمپا کے ہاں کون آیا ہے کہ اس کی ماں نے حلوہ پکایا ہے اور دال میں گھی بھی چھوڑا ہے۔

میں نے کہا آنند پور سے کوئی آیا ہوگا۔ ماں سدا اپنے پیاروں اور مائکے والوں کے لئے ہی اچھی اچھی چیزیں پکایا کرتی ہے۔ سب میرے سر ہو گئیں " واہ واہ ہمیں جیسے آنند پور سے آنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اری ہوش سے بول آنند پور سے آنے والے حویلی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور یہ تیرا آج کیا حال ہے کہ ایک پاؤں یہاں پڑتا ہے اور دوسرا وہاں کیا تو نے نشہ پی رکھا ہے تجھے معلوم نہیں آج تیرے گھر کیا پکا تھا۔ تیری ماں نے

بنیا بچھونا نکال کر دیا ہے۔ اب بتا بھلا کون ہو سکتا ہے پھر وہ سب ناچتی ہوئی میرے گرد گھومتی رہیں اور مجھے مانو پاگل بنا دیا۔

گاؤں میں اور لڑکیوں کی طرح مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ نئے گہنے ملیں گے آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں ہوں گی اور میرے لہنگے کی گوٹ بھی ریشم کی ہوگی۔ میرے سپنے اس سے آگے کبھی نہیں گئے۔ نیم تلے جب عورتیں مل کر سوت کاتتیں اور لڑکیاں مل کر گیت گاتیں تو میرا انگ انگ ایک عجیب خوشی سے جھوم اٹھتا۔ ان دنوں میری سہیلیاں کہتیں۔

"اری چمپا تجھے کیا ہو گیا ہے تیری آنکھوں میں جوت سی کیا جلنے لگی ہے جیسے ان میں تارے بھرے ہوں اور یہ اتنی پھیل کیوں گئی ہیں۔ جیسے سارے چہرے کو ڈھانپ لیں گی۔" ماں بھی مجھ سے بہت پیار سے بولتی کبھی غصہ نہ ہوتی بڑی بوڑھیاں مل کر بیٹھتیں تو کہتیں چڑیوں کی طرح بیٹیوں کے دن بھی بابل کے آنگن میں کم ہوتے ہیں اور بیت جاتے ہیں اور پھر بیاہ کے اور میکے کے قصے لے بیٹھتیں سالوں پیچھے پرانے دنوں میں پلٹ جاتیں اور یوں روتے ہنستے میرے وداع کے دن آ گئے۔

۲

برات آئی ہے تو دھوم مچ گئی اونٹوں کی قطاریں نہر کے پل سے لے کر ہماری حویلی تک تھیں۔ باجوں کے شور اور آدمیوں کی بھیڑ میں لگتا تھا یہ گاؤں اوپر اٹھا جاتا ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں ہمارے آنگن میں جمع تھیں اور ڈھولک کی دھپ دھپ راگوں کی ندی پر بہتی تھی۔ گھنگرو باندھے ناچنے والیوں کے پاؤں میں بجلیاں تھیں سنگار کرواتے ہوئے نائن مجھ سے کہتی جاتی تھی "بٹیا تیرے دھن بھاگ ہیں جو تو ایسے بڑے گھر میں جا رہی ہے ایسا گھر جہاں دودھ دہی کی نہریں بہتی ہیں۔ جہاں کی لونڈیاں باندیاں بھی ریشمی پہنتی ہیں۔ ارے تیرے جیسے بھاگ تو گاؤں میں کسی کے بھی نہیں ہیں تو ایسی بھاگ وتی ہے وہاں جا کر ہمیں نہ بھول جانا۔ اور جانے کیا کچھ کہتی نائن میرے بالوں میں موتی پرو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشم کے ڈھیروں میں دب کر کھو جاؤں گی میرا سانس گھٹ جائیگا دودھ دہی کی نہروں میں یوں بہہ جاؤں گی کہ مجھے کنارہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ اور پھر ساری رونق اور شور کے اوپر مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جنھوں نے مجھے یوں دیکھا تھا کہ میرا دل ڈول گیا تھا اور میرے گیلے ہاتھ سے جو شام نگر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اٹھا تھا پانی کی بوندیں میری باہنہ پر ایسے بہہ رہی تھیں کہ میری جان کو ایک عجیب بےچینی سی لپٹی جا رہی تھی۔ نائن کا کرایا ہوا سنگار چھین بن رہا تھا اور کاجل میری آنکھوں میں ریت کے ذروں کی طرح لگتا تھا۔ میرا من جانے کیوں اس ساری خوشی سے الگ اکیلا تھا اور بہت اداس تھا۔ میں بےحد گم سم بیٹھی تھی اور میری

سکھیاں مجھے چھیڑ رہی تھیں۔ جانے کیوں ایسے ہی بے کار کی ایک آشا کی طرح میرا جی چاہ رہا تھا کوئی مجھ سے اس سجیلے کا ذکر کرے اور کہے کہ تیرا دولھا ایسا ہے۔

ماں کو میں نے دو ایک بار اپنے پاس سے گذر کر اندر کوٹھڑی میں جاتے دیکھا تھا میلے کپڑوں میں بھی اس کا چہرہ جگ جگ کر رہا تھا اور جب کسی سے بات کرتی تو لگتا تھا ابھی اس کے گلے لگ کر مارے خوشی کے ناچنے لگے گی۔ اندر باہر عورتیں اور آنند پور سے آئی ہوئی برادری کی لڑکیاں پاؤں میں چھاجھیں جھنکارتی یوں ہی بھاگ دوڑ رہی تھیں جیسے سب سے زیادہ کام تو بس انھیں کے ذمہ ہو۔ بھیگی ہوئی سہانی رت تھی اور سردی میرے جسم پر یوں لگتی تھی جیسے کوئی انجانا ہاتھ مجھے تسلی دے رہا ہو اور ہوا جب کھلے دروازے سے آتی تو جاں پڑتا جیسے گھبراہٹ میں مجھے تسلی دے رہی ہو۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور عجیب سپنا میرے سامنے تصویروں کی طرح گھوم رہا تھا۔ جس میں میری سہیلیوں کی جھانجھنوں کی جھنکار بھی تھی۔ ڈھولک کے ساتھ گائے ہوئے گیت بھی تھے۔ برات کے ساتھ آئے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن بھی تھی۔ جیسے راس لیلا رچانے والوں کی ٹولی میں گوپیاں کنہیا ہوں۔ اور میں رادھا تھی اور یہ سارے شور کا دریا میرے سامنے بہہ رہا تھا اور میں اس سے الگ تھی۔ ہم دونوں تھے میں بھی اور کوئی دوسرا تھا مجھ سے اونچا میری پہونچ سے دور مگر میرے بالکل قریب جیسے میری جان کا ایک حصہ ہو۔ جیسے میرے انگوں کی ساری دُکھن نکل کر اس کے قدموں میں لوٹ رہی ہو میری جان اس کے پاؤں میں ہو۔ میں ایک ریشم کا کیڑا ہوں جس پر اگر وہ چاہے تو اپنا پاؤں دھر دے۔ میں ایک کنول کا سفید پھول ہوں اگر چاہے تو سانس سے اس میں خوشبو بھر دے۔ میرے قریب کھڑے ہوئے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا ہے تو سُن سَن کر کے میری جان یوں نکل گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ میں رادھا ہوں۔ اور نہ کوئی اور دھرتی کا ایک ذرہ ہوں جو اگر اس کے پاؤں تلے آجائے تو اس کی مان اور شان بڑھ جائے آنگن میں جانے کیسا شور ہونے لگا تھا یا میرا سپنا ہی ایسا تھا کہ مجھے لگا کسی نے میرے پاس کھڑے ہوئے جوان کے سر پر زور سے کوئی شے ماری ہے۔ جھک سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں چیخ مار کر گر پڑی۔

میری سہیلیاں میرے گرد اکٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں "چمپا اری چمپا ہوش میں آ پھیرے ہونے والے ہیں۔ اور تو یوں چیخ رہی ہے یہ کیا بدشگونی۔ اگر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے تو دو گھڑی کو کمر سیدھی کر لے۔"

میری آنکھوں سے آنسو ساون کی جل دھارا کی طرح بہہ رہے تھے اور میرے پرانوں میں جان نہیں تھی۔ سارا کیا ہوا سنگار خراب ہو گیا۔ اور نائن ہاتھ ملتی ہوئی پھر سے پٹاری کھول کر بیٹھی۔ مگر میرا اپنا آپ میرے بس میں نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ سنبھل کر بیٹھوں پر سنبھل نہ پاتی تھی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھرے ماں آئی اور کہنے لگی "چمپا تجھے کیا ہے بیٹی کیا تجھے بیاہ کی خوشی نہیں ہے میں تو بہت خوش ہوں کہ تیرے بھاگ پرماتما نے اچھے بنائے ہیں اور تُو ہے کہ روئے جاتی ہے۔ لڑکیاں تو اس دن کے انتظار میں رہتی ہیں اور اب جب کہ میرے دوار پر یہ دن کھڑا ہے تو گھبرا رہی ہے۔ اری پگلی تو سدا کے لئے تھوڑا جا رہی ہے بس

دو چار دن میں لوٹ آئے گی اور پھر تیرے جیسا دولہا تو بھگوان ہر کسی کو دے۔ نراش کیوں ہوتی ہے دیکھ تو سہی سارے گاؤں سے اچھا تو تیرا گھر ہوگا۔"

باہر سے کسی نے پکارا ہے تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنے میں شور ہوا کہ سسرال والے آگئے ہیں۔ لڑکی باہر آئے تو پھیرے ہوں۔ میرے ننھیال کی عورتیں اور برادری کی لڑکیاں مجھے پکڑ کر باہر لائیں۔ میں کانپ رہی تھی۔ جیسے سردی بہت زیادہ ہوا۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ مندر میں سویرے کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور رات کی جاگی ہوئی عورتیں ڈھولک بہت تیزی سے بجا رہی تھیں۔

سرکنڈوں سے بنے چھپر میں رنگین تاگوں سے بنے لٹو چاروں طرف سے میرے سر پہ سایہ کئے تھے۔ اور گھی کے دیوں کی روشنی میں ہون کنڈ کی آگ بڑی پوتر لگ رہی تھی۔ لپکتی ہوئی جیسے باقی ہر شئے کو اپنے میں کھینچ لے گی۔ پھولوں کے سہروں میں سے جھانک کر میں نے دیکھا تھا ماں کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ آنسو روکے جانے کیسے بیٹھی تھی بھیا اس کی گود میں لدا بیٹھا تھا اور لوگوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میلے میں آئے ہوؤں کو دیکھ رہا ہو اس کی رو رو کر تھکی ہوئی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ پھر وہ انھیں کھولے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دُور پرے میرے آنند پور والے ماما اور اور دلی دیس سے آئے ہوئے چاچا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پھر پھولوں کی لڑیاں کسی عورت نے برابر کر دیں تو سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

پھیرے کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا جانے یہ کون ہے جو مجھے کسی دوسرے گاؤں سے وداع کرانے آیا ہے میرے دل میں کھلبلی سی مچی تھی اور میں چاہتی تھی۔ کم از کم گھونگھٹ اور پھولوں کا یہ بوجھ ہٹا کر ایک بار اس چہرے کو دیکھ لوں۔ اور آج مجھے معلوم ہے چہروں میں تو کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ کتنے بھولے دکھائی دیتے ہیں۔؟

پنڈت جی اشلوک پڑھ کر آگ پر جانے کیا کچھ ڈال رہے تھے کہ باس سے میں بے سدھ ہوئی جاتی تھی۔ آج کتنے زمانوں کے بعد بھی وہ باس مجھے انوکھی اور الگ سی میرے ذہن کے ایک کونے سے جہاں بھولی بسری یادوں کے ساتھ پڑی ہے آیا کرتی ہے۔ سامگری کی سوگندھ چلتے ہیں میرے لہنگے کی گوٹ میرے آگے آگے بجلی کی طرح کوند رہی تھی اور پیچھے سے کھلی چولی میں اتنے کپڑوں میں لپٹی ہونے کے باوجود مجھے لگتا تھا میں ننگی ہو جاؤں گی۔

بیٹھی ہوں تو یوں تھکی ہوئی تھی جیسے جنموں کا سفر کر کے آئی ہوں اور لگتا تھا گر جاؤں گی یہ سالے لوگ جو میرے آس پاس بیٹھے تھے جانے کون تھے اور وہ جو میرے قریب بیٹھا تھا وہ جانے کون تھا۔ میرے ساتھ کیا بیتنے والا تھا۔ پھر ہون کنڈ کو ہٹا کر مجھے اور اسے جو اب میرا بھگوان تھا آمنے سامنے بٹھا دیا گیا۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ میرا ہاتھ کبھی اٹھایا جاتا تھا اور کبھی رکھ دیا جاتا۔ میری آنکھیں تھکن کے مارے بند ہوئی جاتی تھیں جب نائن نے کہا تھا کہ "بی بی آنکھیں کھول کر اپنے دولہا کو تو دیکھ" میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کو دیکھنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں کھل نہ سکیں۔ ساری رسمیں ہو چکی تھیں۔ سورج نکلنے والا تھا۔ جب سرکنڈوں کی

اس کوٹھری میں سے سب کو نکال کر میری سکھیوں نے مجھے اس کے ساتھ قید کر دیا تھا جو میرا پتی تھا۔
گھی کے دیئے کی لو مجھے بجھتی ہوئی لگی اور پھولوں کی باس تھکن سے بیہوش ہوتی جان پڑی جب کسی نے میرا گھونگھٹ الٹ دیا ہے۔ بھگوان جانتا تھا میں کچھ دیکھنا نہ چاہتی تھی بس مجھے صرف سننے کا انتظار تھا۔ بیگانے ہاتھوں کا جو میری طرف بڑھیں گے اور لاج کے مارے میں دوہری ہو جاؤں گی۔ اور اس انتظار میں جیسے زمانے بیت گئے۔ دیئے کی لو بھڑکی اور بجھ گئی اور اندھیرے میں پلنگ کی دوسری طرف بیٹھنے کی آواز آئی۔ ہولے ہولے میرے انگ ڈھیلے پڑ گئے شاید میں انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔
آج تک یہی انتظار ہے جو میرے گرد باقی ہے۔ اور جو کچھ باقی دنوں میری زندگی میں ہوا ہے اس نے بھی اس انتظار کرنے کے جادو کو نہیں توڑا۔ میں نے دوار دوار بھیک مانگی ہے۔ پر بھکشا کے ناتے بھی کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ جانے کتنی آنکھوں میں میں نے جھانکا ہے۔ جانے کتنے ہاتھوں کو میں نے چھوا ہے۔ پر میرے شریر میں وہ اینٹھن ویسی ہی ہے۔ وہ تناؤ جو اس صبح کو دیئے کے بجھنے کے بعد سے اب تک میری رگوں میں خون کے ساتھ موجود ہے بھگوان کیا یہی بیاہ تھا؟
ڈولی اٹھی ہے تو میں ڈھنگ سے بیٹھ نہ سکتی تھی۔ نہر کے پل سے لے کر دریا کے گھاٹ تک اونٹوں کی قطاریں تھیں جن کی گھنٹیوں سے لگتا تھا۔ سارا جہان مجھے وداع کرانے آیا ہے۔ ماں کے رونے کی آواز سب سے الگ اونچی تھی۔ نائن میرے کپڑوں کو ٹھیک کرتی ڈولی میں بیٹھی ہچکولے کھاتی میرے ساتھ آن لگی تھی۔ بابا اور بھیا اور وہ سارے جن کے درمیان میں نے آج تک کا وقت گزارا تھا کہاں تھے۔ وہ بیگانہ آدمی جو آج صبح میرے رنگین پلنگ کی پائینتی بیٹھا رہا تھا کیسا ہوگا۔ دریا کے گھاٹ تک گاؤں کی عورتیں جو گیت گاتی آئیں تھیں وہ میری سمجھ میں نہیں آپاتے تھے جیسے کسی اور ہی بولی میں ہوں۔ مجھے لگتا تھا میری ارتھی اٹھ رہی ہے۔ میں نے برے خیالوں کو سر جھٹک کر دور کرنا چاہا۔ اور نائن سے کہا کہ میرا دم گھٹتا ہے ذرا سا پردہ تو سرکا دے۔
دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ کشتی کو رنگوں ناگوں اور ریشمی پھندنوں سے سجایا گیا تھا۔ جب چپو چلتے تو گھنگروں کی جھنکار بڑی مدھر لگتی۔ مجھے پھر لگا میں رادھا ہوں جو پرائے دیس میں اپنے کرشن کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں پر یہ جو میرے پاس بیٹھا تھا کون تھا۔ گم سم اور خاموش جیسے اس پر کوئی جادو کر دیا گیا ہو۔ دریا پر کی ٹھنڈی ہوا آ آ کر میرے چہرے پر لٹکے سہرے کو ہلاتی تھی اور میٹھی پھوار کی طرح میرے جسم پر پھیلتی تھی پر میری رگیں جیسے سخت پڑ گئی ہوں پتھر کی طرح اس ٹھنڈ کو قبول کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ جیسے میں مورتی بن گئی ہوں۔ جس پر پانی کی پھوار صرف اوپر کی سطح کو ہی بھگو سکتی ہے۔ آج تک کسی ٹھنڈ نے میرے انتر کو ٹھنڈا نہیں کیا۔ میں تو اپنا نرک اپنے ساتھ لئے پھرتی ہوں میرا نرک جس میں ہر کام کا آخر تھکن اور اینٹھن ہوا ہے۔ مجھے آج تک کسی نے سکون کی اس میٹھی نیند نہیں سلایا جو اس سرکنڈوں کی کوٹھری میں رنگین پایوں والے پلنگ

پر سونے سے پہلے میری تھی۔

پھر میرا گاؤں پیچھے چھوٹ گیا اور ناؤ آگے بڑھ آئی۔ دریا کا دھارا وقت کی طرح جہاں جی چاہے بہا کر لے جاتا ہے ملاّح زور لگا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں پانی تھا اور دل چاہتا تھا یہ لہریں مجھے اپنے میں چھپا لیں دوسرے کنارے میں آموں کے بُور کی خوشبو نے میرا سواگت کیا اور سایوں والے ٹھنڈے راہ پر میں اس گاؤں کی طرف چلی جو اب میرا دیس بننے والا تھا جس کی مٹی میں میرے جسم کو ملنا تھا جو پرماتما نے میرے لئے بنائی تھی۔

ڈولی کے آگے آگے چلنے والا سوار بانکا چھبیلا تھا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر بیٹھا ہوا۔ لوگوں سے ہنس ہنس کر بولتا جاتا تھا۔ نائن نے پردہ سرکا کر کہا بی بی باہر تو جھانک دیکھ تو سہی کتنا سندر نگر ہے درختوں کی اوٹ سے ہرے ہرے کھیتوں پر سے ہوا اناج کی خوشبو لا رہی تھی۔ پر نتھ بار بار میرے ہونٹوں پر آ کر لگتی تھی۔ اور سانس لینے میں ناک دُکھ رہی تھی اس لئے میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں تو آپ مہکار بنی ہوئی تھی۔

۳

میں نے جب آئینے میں جھانکا ہے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تو یہ میں تھی میں جو چمپا تھی اور جو پرسوں تک کھیتوں میں گھومتی ندی میں تیرتی اور آنگن میں اتنے اونچے پینگ چڑھاتی تھی کہ میری سکھیاں بس بس کہنے لگتیں۔ یہ میں تھی چمپا جس کو ماں نے کبھی اچھا کپڑا پہننے کو نہیں دیا۔ تہوار کو بھی جسے کبھی ریشم دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ شام نگر کی وہ لڑکی اب گزوں ریشم میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی اور بالوں میں پروئے موتی چہرے کے مقابلے میں ماند تھے آنکھوں میں آکاش کے سارے ستاروں کی جوت تھی اور کاجل کی لکیریں دھڑکتی ہوئی رگوں کی طرح آنکھوں میں پکڑ دھکڑ کر رہی تھیں۔ پاؤں ہلاتی تو بچھوے بج اٹھتے اور ہاتھ ہلتے تو گھنگروں والے کنگن ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ ماتھے پر لٹکے ٹیکے میں جڑے ہیروں سے روشنی نکلتی تھی اور جو عورت گھونگھٹ الٹ کر دیکھتی حیران ہو کر پیچھے ہٹ جاتی۔ ہولے ہولے دن گھسکتا رہا اور شام کی طرف جاتا رہا۔ اور پھر نرم سی ہوا چلنے لگی۔

اس رات جانے کتنے پرانے اور پہلے خواب میرے من کی دیواروں سے آ آ کر ٹکرائے ہیں اور میں نے کیا کیا سوچا۔ پھر تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا چاند نکلا۔ رنگین پایوں والے پلنگ کے چاروں طرف پھولوں کی چادروں کی مہکار تھی اور گھی کے دیئے جل رہے تھے باریک بادلے کے ڈوپٹے میں سے میرا سنگار جانے کیسا لگ رہا ہوگا۔ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی تھی اپنے پاؤں کو دیکھتی تھی کیا یہ میں ہی تھی کہ

گھاٹ سے یہاں تک آنے میں کتنے ہی جنم پار کر گئی تھی۔ یہ جادو کیسا دیس تھا۔ اپنے جسم کی پاگل کرنے والے باس سے میں آپ ہی بیہوش ہو جاتی تھی۔ بھگوان۔

پھر اس آنگن کی طرف آنے والے راہ پر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میری رگیں اسی طرح پتھر ہو گئیں۔

۴

میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ جس کو مجھے بھگوان بنا کر پوجنا تھا اس نے مجھے دیوی سمجھ کر پوجا میں چاہتی تھی بچپن سے سوچتی آئی تھی جانے کون میرا دولھا ہوگا۔ میں کیسے کیسے اس کی سیوا کروں گی۔ پر میرے من کی پوجا میرے من ہی میں رہی۔ میرے دل کے بند کبھی کھل نہ سکے میں اس پدوی سے نیچے اتر نہ سکی جس پر میرے اپنے بھگوان نے مجھے بٹھا دیا تھا۔ اس رات بھی میرا گھونگھٹ الٹا ہے تو میں منتظر رہی ہوں مگر اس نے کہا "چمپا تم تو دیوی ہو دیویوں سے بھی زیادہ سُندر اور سُندرتا میں شکتی ہے پھر اس نے جھک کر میرے پاؤں چھولئے اور انھیں اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اس کی اِس بھول نے میری ساری زندگی کو برباد کر دیا ہے بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے میں نے اس آسن سے اترنے کے لئے جو جتن کئے ہیں سب بے کار گئے ہیں صرف اس ایک لمحے کی غلطی نے میرے سر کو گناہوں سے جھکا دیا ہے۔ پر پھر مجھے جو چاہتے تھا وہ میں نہ پا سکی۔ تم مندر میں جاؤ اور تم دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکو اور تم یہ دیکھو کہ تم آپ مورتی ہو اور آپ ہی دیوتا تو تمہارا من کیا کہے گا۔ میں نے اپنا کیسا کیسا سر مارا ہے کہ اور کسی کو نہیں تو کم از کم مالتی کو ہی سمجھا سکوں کہ قصور میرا نہیں ہے پر مالتی مانے تو؟

میں نے کتنی بار کہا ہے مالتی میں تو پجارن تھی۔

اور مالتی کہتی ہے ماں جی تم سے بڑھ کر بھاگوان کون ہوگا جسے ایسا پتی ملا ہے جو پوجتا ہو جو دیوی سمجھتا ہو۔ ارے ماں جی ہر کسی کے ایسے بھاگ کہاں؟

میں مالتی کو کیسے بتاؤں میں نے کیا چاہا تھا۔ اور مجھے کیا ملا۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی غصہ ور ہو کہ میں اس کے خوف سے کانپتی پھروں۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی مجھے عورت سمجھے اور عورت کی کمزوریاں تو بہت ہوتی ہیں۔ جنھیں پجاری معاف نہیں کرتا پر پتی بھول سکتا ہے۔ ہمارا گھر سورگ نہ بن سکا۔ وہ مندر کا بڑا پجاری تھا اور اس نے آپ دیوی بنا کر میری پوجا شروع کر دی۔ اس کی عاجزی دیکھ کر میرا جی چاہتا اس کے سر پہ زور سے ٹھوکر ماروں۔ جب وہ میرے پاؤں اپنی آنکھوں سے ملتا تو میں یوں پتھر کی طرح پڑی رہتی جیسے سچ مچ میں دیوی ہوں۔ او بھگوان کیسی کیسی یادیں آج پرے باندھے چلی آتی ہیں۔

جب میں اس کے لئے آپ کھانا بناتی تو وہ کہتا چمپا نہیں یہ تمہارا کام نہیں ہے تم میری دیوی ہو کر یہ سب کچھ کر کے مجھے اپرادھی بنا رہی ہو۔ تم تو صرف اس لئے بنائی گئی ہو کہ تمہاری پوجا کی جائے۔ میرے چاروں طرف ریشم کے ڈھیر ہوتے۔ سونے اور موتیوں کے گہنوں سے میرے صندوق بھرے تھے باندیوں کی کمی نہ تھی۔ پر ہر رات سپنے میں میں اپنے مائکے گھر جاتی جہاں کی راہوں کی دھول بھی اب مجھ تک نہ پہنچ سکتی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح ندی کنارے پیپل کے سائے میں دھڑکتے دل کے ساتھ میں اس سوار کا انتظار کرتی۔ کیا وہ کھوجتا کھوجتا مجھ تک آ نکلے گا۔

میری آنکھوں میں جلی جوت ماند پڑ گئی اور روکھے پھیکے دن ایک کے بعد ایک یوں گزرنے لگے جیسے گھسٹ رہے ہوں۔ میرے گالوں کی لالی اور میرے ہاتھوں کا لوچ جیسے گذرے دنوں کی بات ہو۔ میں سنگھار کرتی تو بھی اس نے مجھے جس آسن پر بٹھایا تھا اس سے اتار نا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ میری رگیں جسم میں یوں جمنے لگیں جیسے میں برف کے پہاڑوں میں دب گئی ہوں۔ جب پدمنی پیدا ہوئی ہے تو چند دنوں میرا دل اس سے بہل گیا ہے پر پھر وہی سستی اور وہی بیزاری میرے گرد آ گئی اور پدمنی بھی اس ڈھنڈ کو جو میری رگوں میں تھی گرم نہ کر سکی۔

جب پدمنی نے پاؤں چلنا شروع کیا ہے اور توتلی باتیں کرنے لگی ہے تو ایک نئی سوچ نے میرے من کو گھیرا۔ کہیں اسے بھی ایسا دیوتا نہ مل جائے جو اس کی پوجا کرے۔ اس کا باپ اسے پدماوتی کہتا تھا اور جب جھک کر اسے پیار کرتا تو اس کی آنکھیں غرور سے چمک جاتیں۔ پدمنی آنگن میں چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی اور اس کے پیچھے باندیوں کی قطار ہوتی۔ میں بڑے پلنگ پر جو دالان میں پڑا رہتا لیٹے لیٹے کروٹ بدل دیکھتی مگر میرا دل بجھا سا رہتا گرمیوں کی دوپہروں کو جب پدمنی اپنے بابا کے ساتھ سوئی ہوتی اور رنگین پنکھے ریشمی ڈوریوں کے ساتھ بندھے بے آواز ہمارے سروں پر ہلائے جاتے تو میں دالان سے باہر درختوں کو دیکھتی جن پر نئے پتّے چمکتے ہوتے اور نئی کونپلیں پھوٹی پڑتیں۔ ہر شئے پر بہار آتی ہے مجھ پر جانے کب بہار آئے گی پر مجھے خود معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ میں کس شئے کے انتظار میں ہوں۔ کون آس ہر آہٹ پر مجھے چونکا دیتی ہے۔ اس بے کاری سے اکتا کر میں نے زور شور سے گھر کو سنوارنا اور ہر کام میں حصہ لینا شروع کیا۔ رسوئی سے لیکر باہر تک سب لوگ چونک اٹھے۔ پدما کے بابا نے مجھے کہا بھی " بھلا تمہیں یہ سب کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے کام تو ہوتے رہتے ہیں تم اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہی ہو۔

انہی دنوں دریا کے پاس گھاٹ سے ذرا ہٹ کر ایک جوگی نے اپنا ڈیرہ لگایا۔ اور لوگ مندر کو چھوڑ کر ان کے درشنوں کے لئے الٹے پڑتے تھے۔ ایک میلا سا رات دن گھاٹ پر لگا رہتا۔ روز باندیاں آتیں اور کہتیں " ماں جی سادھو مہاتما تو جس کی طرف نظر بھر کر دیکھتے ہیں اس کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ مہاتما نے آج ایسا کر دیا۔ نت نئے قصے سنتے سنتے میرے جی میں بھی ترنگ اٹھی اور میں نے اپنی نند کو جو ابھی کنواری

تھی اور مجھ سے بہت چھوٹی تھی ساتھ لیکر مہاتما کے درشنوں کو جانے کا ارادہ کیا۔ جاتے جاتے چوکھٹ کے اندر ایک دم رُک کر میں نے سوچا بھگوان نے مجھے سب کچھ دیا ہے دولت ہے چاہنے والا پتی ہے رونق کے لئے بچے ہیں خدمت کے لئے باندیاں ہیں۔ میری تو کوئی ایسی آس نہیں جو مجھے پریشان کرے گی۔ بھلا میں کیا لینے مہاتما کے پاس جا رہی ہوں۔ پر پیچھے سے آتی ہوئی وسنتی نے کہا۔ "بھابی جلد چلو دیر ہو گئی ہے لوٹ کر بھی تو آنا ہے۔ بھیا کو پتہ چل گیا تو ناراض ہوں گے۔" اور میں بنا یہ سوچے کہ مجھے کسی شے کی آشا نہیں کوئی شے لینی نہیں چل پڑی۔

لوگ گھاٹ پر کشتیوں کے پاس اور گھاس والی زمین پر بیٹھے تھے جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور میلے کا سا سماں تھا۔ عورتیں اور بچے جوان اور بوڑھے سبھی تھے دل میں آشائیں لے پرارتھنا کرتے آنکھیں بند کئے پربھو سے لو لگائے بھکشا مانگنے والے۔ مجھے ان سب کو دیکھ کر ہنسی بھی آئی کیا مہاتما ان سب کے دلوں کا حال جانتے ہیں کیا ان سب کو وہ دے سکیں گے جو انھیں چاہئے ہوگا۔ بھگوان تو ہر کسی کو وہ دے نہیں پاتا جو انھیں چاہئے یہ مہاتما اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی آس پہنچائیں گے۔" مجھے یونہی ہنسی آئی۔ جوگی مہاراج کے آسن کے آس پاس لوگ رام نام مالا جپ رہے تھے اور ہولے ہولے بولتے تھے آدمی سر جھکائے بیٹھے تھے ایک دنیا تھی بھیڑ تھی جیسے لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

عورتوں اور باندیوں کے ایک جمگھٹے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انھوں نے آدمیوں کو پرے ہٹا دیا۔ ہم نے چادریں اپنے ماتھے تک نیچی کر رکھی تھیں اور باندیوں نے بھی منہ چھپائے ہوئے تھے۔

مہاتما نے میری طرف دیکھا تو کہا دیوی تم میرے اور پاس آجاؤ تو میں تم سے بات کروں۔ میرا دل یونہی دُھک دُھک کر رہا تھا اور مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ گئی تھی۔ جب گھونگھٹ ہٹا کر نیچی نظریں کئے میں مہاتما کے سامنے بیٹھی ہوں تو انھوں نے کہا "آنکھیں اوپر اٹھاؤ۔"

میری نگاہیں جانے کیوں جھکی جاتی تھیں اور آنکھیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ لگتا تھا صدیاں بیت گئی ہیں اور ان نظروں کے سامنے میں بھسم ہو جاؤں گی پھر آپ ہی آپ میرا ڈر دور ہو گیا اور میں نے اوپر دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میرے انتر میں ٹٹول رہے ہوں۔

پھر بہت آہستہ کہنے لگے تمہاری آنکھوں میں اتنی تنہائی ہے اور زمانوں کا دکھ ہے۔ پر تم دکھی نہیں ہو دیوی تم صرف زندگی سے نراش ہو۔ تم نے دریا دیکھا ہے پر تباہ کرنے والے دیوتا کا چہرہ نہیں دیکھا تم نے بہت آرام کر لیا ہے۔ تمہارے من میں جوت جلے گی اور ضرور جلے گی۔ پر یہ تمہیں اور تمہارے پتی کو تمہاری بیٹی کو تم سے جدا کر دے گی۔ یہ روشنی تم سے بہت کچھ چھڑا دے گی۔ تم نے آرام کے بہت دن گذار لئے ہیں اب تمہارے لئے جلنے کے دن آئے ہیں۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ آنے والی گھڑی ٹل جائے مگر ہونے والی باتیں ہو کر رہتی ہیں۔ جو نصیب میں بدا ہو وہ ضرور ہونا ہے ڈرنا بیکار ہے تم نے اب تک سکھ

بھوگ لئے ہیں اب تم کنشٹ اٹھاؤ گی۔ ہر آدمی جو پیدا ہوتا ہے اس کے ماتھے کا لکھا اس دنیا میں پورا ہوتا ہے جاؤ میں تمہیں آشیرباد دیتا ہوں کہ طوفان تمہارے سر پر سے جلد گذر جائے۔" پھر انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

وسنتی کو دیکھا تو کہنے لگے "تم کینا ہو میں تمہیں کیا کہوں اگر سال سے پہلے تمہارے ہاتھ پیلے ہو گئے تو تم سکھ شانتی سے رہو گی نہیں تو ایک روگ اپنی جان کے ساتھ لے جاؤ گی۔ تم جو چاہو گی تمہیں وہ کبھی نہ مل سکے گا۔ آدمی ایسی دھرتی سے بنا ہے کہ وہ ان ساری چیزوں پر جو اُسے مل جاتی ہیں کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کرتا وہ کئی بے گانی چیزوں سے ٹکرا جاتا ہے جب تک ٹھوکر نہ کھائے وہ سنبھل نہیں سکتا۔" اس نے سر جھکایا تو انھوں نے اسے ایشرباد دی اور دیر تک اس کے سر پر ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے رہے۔

راہ میں وسنتی گھڑی گھڑی میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھی "بھابی ہم بے کار ہیں آئے اب یہ وہم میرے جی میں جڑ پکڑ لیں گے۔ نصیب کی باتیں پوچھنا بیکار ہوتا ہے۔ بھگوان نہ کرے مجھے کوئی روگ لگے۔" وہ چپ ہو گئی تو باندیاں کہنے لگیں "دیکھو تو سہی اوپر سے مہاتما بنتا ہے اور دل میں کتنا کرودھ بھرا ہے اچھا ہوا ہم نے کچھ نہ پوچھا ورنہ جانے کیا کیا بتاتا۔"

میں نے کہا وسنتی مہاتما نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس کا برا مانا جائے۔ یہ اُن کا کہا تو نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو انھیں کیسے پتہ چلتا کہ تم کنواری ہو۔ اور پھر ہم تو اندھیرے میں تھے۔

پھر ہم سرکنڈوں کی راہ سے جو گاؤں کے باہر سے ہمارے گھر تک جاتا تھا تیز چلنے لگے۔ سرکنڈوں کے ریشمی بور ہمارے سروں پر لگتے تھے اور سرسر کرتی ہوا اکیلی اکیلی بین کرتی ہوئی بھاگی جاتی تھی۔ گاؤں کے باہر جھونپڑیوں میں دیئے ٹمٹما رہے تھے اور جب ہم شمشان کے پاس سے گزرے ہیں تو بڑے بڑے پر پھیلا کر چمگادڑیں تیز تیز ہمارے آگے پیچھے اڑنے لگیں۔ اور ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی زور زور سے ہنس رہا ہو میں خاموش تھی اور سب سے آگے تھی پر وسنتی سہم سہم کر میرے کندھے سے لگتی تھی اور کہتی تھی "بھابی ہم اس راہ سے کیوں آئیں بھلا شام کے وقت بھی کوئی اس طرف سے نکلتا ہے۔ بوڑھی باندی جو سب سے پیچھے آتی ہوئی ہانپ رہی تھی اس کی بات سن کر کہنے لگی "بی بی جو نصیب میں بدا ہے ہوتا وہی ہے وہم کرنا اور ڈرنا بے کار ہے۔ بالکل بے کار۔

پھاگن ختم ہو رہا تھا جب ہمارے گاؤں میں اشنان کا میلا لگا ہے۔ دھرتی جیسے نیا روپ دھار کر روشنی سے نہا کر نکلی تھی۔ نرم ہوا چلتی اور نیلے آسمان پر آکاش پر چاند تاروں کے جھرمٹ میں بہت بھلا لگتا پرندوں کے پروں میں نیا رنگ تھا اور ان کی آوازیں یوں تازہ تھیں جیسے پہلی بار انھوں نے بولنا سیکھا ہو۔ کھیت دور دور تک ہریالی سے لہلہاتے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیں دوہری ہو جاتیں۔ میں جب کھڑکی کھول کر

باغ سے پرے دیکھتی تو مجھے لگتا اس زمین کو اور ان درختوں کو جنموں سے دیکھتی آئی ہوں اور پھر بھی پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ آموں پر بور تھا جس کی باس سے نیند سی آنے لگتی اور بڑے سہانے سپنے دکھائی دیتے۔ میں کھڑی کھڑی جانے کیا سوچا کرتی تھی۔ سفید بگلوں کی قطاریں میرے سر پر سے اڑتی جاتیں اور آکاش کا نیلا سورج کی روشنی میں بڑا گہرا ہو جاتا۔ جیسے کسی سہاگن کا ڈوپٹہ ہو۔ میرا دل ہلکا تھا اور بہت سالوں سے جو خوشی میں نے نہیں دیکھی تھی جانے میرے گرد تھی۔ میری رگوں کی اینٹھن کم تھی اور مجھے مہاتما کے لفظ رہ رہ کر یاد آتے تھے۔

آئینہ سامنے رکھے میں پہروں سنگھار کرتی اور اپنی آنکھوں میں دیکھتی کہ تنہائی کہاں ہے۔ میری سکھیاں تو کہا کرتی تھیں کہ ان آنکھوں میں مانو ستارے کوٹ کر بھرے ہیں۔ ارے یہ سوئی ہوئی دھرتی کی طرح ہیں۔ مجھے کون جگائیگا۔ پوجا میں میرا من آج کی طرح کبھی بھی نہیں لگا۔ شانتی کی آشا میں نے آج کی طرح کبھی نہیں کی۔ اور میرے نصیب میں نہ شانتی ہے اور نہ مکتی۔ پر اس بھاگن میں میں مندر جاتی سیڑھیوں کو دھوتی اور دیوتا پر پھول چڑھا کر پرارتھنا کرنا چاہتی مجھے کیا چاہئے تھا۔ بھگوان تو تو من ڈھکی چھپی آشاؤں کو جانتا ہے۔ انتریامی مجھے کس شے کی چنتا تھی؟ اور من ہی من میں ہنستی کہ میں بھلا کیا مانگنے آئی ہوں۔ اِس آسن پر کیوں جھکی ہوں اور قدموں کی دھول کیوں ماتھے پر چڑھاؤں گی مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہئے تھا اشنان میلے میں جا کر پانی میں جھلکتے اپنے بدن کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے جیسے بلور میں ترشا ہوا ہو۔ بھلا مٹی کا یہ رنگ کسے اچھا لگتا تھا اور پھر بھی اس رنگ کے لئے میرے پتی دیو میری پوجا کرتے تھے۔

عورتیں مجھے ملتیں تو کہتیں بھگوان تمہاری طرح سب کا نصیب کرے۔ تم بھاگونتی ہو۔ ہماری لڑکیوں کے سر پہ ہاتھ پھیرو۔ اور میں یہ نہ کہہ پاتی کہ میں تو مورتی ہوں میری رگوں میں گرمی نہیں میرے دل میں کسی شے کو پانے کی آشا نہیں جنتا نہیں۔ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں کیا ہوں پھر تم لوگ کیوں مجھ سے آشیرباد مانگو؟ گیتوں کے بول میرے دل میں گونجتے رہتے۔ میرا کے بھجن پڑھتے ہوئے میں سوچتی میں کیوں رادھا نہ ہوئی۔ آج سے زمانوں پہلے بھگوان نے مجھے کیوں نہ پیدا کیا۔ اور پھر برہا کے گیت سنتے میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آ جاتے مجھے کس کا دکھ تھا میں کیوں برہن تھی؟ پدمنی کو سینے سے لگا کر یوں بھینچتی کہ وہ چیخ اٹھتی اور وسنتی کام کرتے کرتے سر اٹھا کر کہتی "بھابی آج کل تم اتنی سندر کیوں لگتی ہو مانو چمپا کی نئی کھلی کلی ہو۔ میں گھبرا کر پدمنی کو چھوڑ دیتی۔ وسنتی کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھتیں اور میں شرما کر اپنے دالان میں چھپ جاتی۔

پر وسنتی وہاں پر بھی میرا پیچھا کرتی اور کہتی "اچھا بھیا کو تو آلینے دو دیکھو تو سہی کیسا کیسا تمہیں پریشان کرتی ہوں۔ اس کے بھیا کے نام پر یوں لگتا جیسے کسی نے زور سے میرے سر پر کوئی چیز ماری ہو۔ میری رگوں میں خون ٹھنڈا پانی بن جاتا اور میں کہتی "وسنتی کبھی کوئی کام کی بات کیا کر بھلا تجھے کیا ملے گا مجھے پریشان کر کے اور پھر نراش سی ہو کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوتی اور باغ میں اترتی چڑیوں کو ڈال ڈال پر پھدکتی ہوئی دیکھا کرتی اور سوچتی آدمی ایسا کیوں ہے کہ کسی شے سے بھی خوش نہیں ہو پاتا؟

وسنتی کی بُوا بھی اشنان میلے کے لئے اپنے گاؤں سے آئیں اُن کے ساتھ ان کی بہوئیں تھیں اور بیٹے پوتے تھے۔ دو چار سال بیماری کی وجہ سے ان میں سے کوئی آنہ سکا تھا اور اب جبکہ بُوا چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو سبھی کو لے کر مندر چڑھاوا چڑھانے آئیں گھر میں عجیب گھما گھمی اور رونق ہوگئی۔ میرے بیاہ پر آئیں تو بہو کے گھر بچہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد لوٹ گئی تھی۔ ان سب سالوں ان کے بیٹے آتے تو باہری سے پلٹ جاتے رہے۔ میری ساس ہوتیں تو خیر اور بات تھی۔ میری ماں بھی بھیا کو لے کر آئی تھی اور میری موسی کا بیٹا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ گھر میں اتنا منگل تھا اور دن رات ایسی بھیڑ رہتی کہ میرا دل پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ وسنتی کی بوا اور میری ماں مندر سے لوٹ کر آئیں تو پہروں بیٹھی جانے کہاں کہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ میرے پتی ان دنوں گھر میں بہت ہی کم کم آپاتے۔ اتنے اپنوں کی وجہ سے انکیں میری اداسی کی کوئی ایسی چنتا نہ تھی۔ بھیا ان پانچ چھ سالوں میں بڑا ہوگیا تھا۔ اور جب چمپا کہتا تو لگتا کسی اور کو پکار رہا ہو۔ بدتمی اس کے کندھے سے نہ اترتی۔ میری موسی کا بیٹا کہیں پڑھتا تھا اور رہاں کے اکیلے ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ آگیا تھا۔ وہ بنارس سے چھٹیوں میں آیا تھا اور بہت بانکا تھا مجھے کہنا دیدی تو تو بڑے گھر کی رانی بن گئی ہے کبھی ہم سے کاہے بولے گی۔ اور میں اس کے پاس بیٹھی ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ باقی لوگ بہت کم اندر آتے۔ باہر میلہ تھا اور اتنی رونق تھی کہ اندر آنے کی فرصت کسے تھی۔

ایک دن بُوا کے سب سے چھوٹے پوتے کی طبیعت بگڑ گئی تو بہو اداس ہوگئی اور بچہ پکار پکار کر بابا بابا کہتا رہا تو بُوا نے کہا چمپا اگر تجھے بُرا نہ لگے تو مُنّے کے بابا کو گھر میں بلالوں۔ بچہ کب سے پکار رہا ہے اور نہیں بہلتا۔"

میں نے کہا بھلا اس میں کوئی پوچھنے کی بات ہے بُوا ہم دوسرے دالان میں ہو جائیں گے ہمارے لئے کوئی بیگانہ تو نہیں بس اتنے دنوں نہ ملنے کی وجہ سے ذرا جھجک سی ہے پھر وسنتی اور میں دوسرے دالان میں چلے گئے اور ریوں میں نے بانکے بہاری کو دیکھا۔

اس کے کانوں میں بالے ہلکورے لے رہے تھے اور وہ آنکھیں جھکائے تیز تیز قدموں سے آنگن کو پار کر رہا تھا۔ پھر مجھے لگا یہ سب لوگ یہ سارا زمانہ یہ ہر شے جھوٹ اور پھیکا رہے۔ میں ندی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں اور میرے اُٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں وہ دیکھ رہا ہے پھر اس نے آہستہ سے سر پھیر کر ایک لمحہ کو میری آنکھوں میں جھانکا ہے اور جب میرا سینا ٹوٹا ہے تو وہ بچے پر جھکا پوچھ رہا تھا "کیوں ارجن منے" مجھے کیوں پکارتے ہو باہر میلے میں چلوگے۔ مٹھائی کھاؤ گے۔ بچہ اس کے گلے کے ساتھ لگ کر زور سے رونے لگا اور میں نے وسنتی کے کندھے کو اس زور سے دبایا ہے کہ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "بھابی تمہیں کیا ہوگیا ہے تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑتا جاتا ہے۔ تم اچھی طرح سے تو ہو۔"

میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے جیسے زمانوں سے پیاسی ہوں اور زبان منہ میں سوکھ کر لکڑی ہوگئی تھی بس سر ہلا کر کہا میرا جی اچھا نہیں وسنتی مجھے پانی لاکر دو۔ اور میری صورت کو تکتی وسنتی بھاگی ہوئی گئی اور

پانی لے آئی۔ جنم جنم کے پیاسے کبھی پیاس بجھا سکے ہیں۔

بانکے بہاری بچے کو گلے سے لگائے باہر چلا گیا۔ شام کا نیلا دھند کا چاروں طرف تھا۔ ہوا آواز سے چل رہی تھی اور سرد تھی۔ میں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے سوچا رات کتنی سہانی اور سندر ہو گی تاروں بھری اور سورگ کی اپسراؤں کی طرح نازک کامنی سی۔ پردوں میں اپنا چہرہ چھپائے اپنے پائل چھنکاتی جانے کتنے من لبھائے گی۔ جانے کتنے لوگ اپنی پیاس بجھائیں گے۔ کتنے لوگ اس کی اوٹ میں اپنے ہردے کی پیڑ اور من کی دکھن ایک دوسرے سے کہیں گے؟ اور وہ ساری رات ایک نیلی دھند میں لپٹی میں بےسدھ سی پڑی رہی میرا جاگا ہوا من نئے پیدا ہوئے بچے کی طرح اپنی حالت پر آپ ہی حیران تھا۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی اور سوچ نہ سکتی تھی۔ ساری آوازیں مجھے اپنے سے دور باہر کہیں اور گھومتی لگتی تھیں۔ دو ایک بار وسنتی نے مجھے کھانے کے لئے کہا تو میں نے اسے کہہ دیا میرا جی اچھا نہیں ہے اس نے کہا کیا بھیا کو بلاؤں تو مجھے یوں لگا جیسے بھیا جانے کون ہو بھلا اسے مجھ تک بلانے سے میرا جی کیسے اچھا ہو سکتا ہے۔ ارجن کی حالت بگڑ گئی۔ اس شام سردی میں باہر سے جاتے ہوئے بانکے بہاری نے خیال نہیں کیا تھا اور اسے بخار آیا ہے تو وہ بیہوش ہو گیا۔ میں سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے سے باغ میں اتر جاتی اور سیڑھیوں پر بیٹھی تالاب کے کنارے پہروں پانی میں جھانکتی رہتی۔ بیہوش سی شہد کی مکھی کی طرح جو زیادہ خوشبو میں بس درخت کے گرد چکر لگاتی رہے اور اسے بھول جائے کہ وہ شہد لینے کے لئے آئی ہے بھونرے کی طرح جو پھول تک پہنچ کر بس کھو جائے اور اپنا منہ پیلا کئے تکتا چلا جائے اور یہ میرا جسم ایک نئے سانس سے بسا ہوا اتنا بیگانہ لگتا تھا کہ گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو تکتی تھی۔ ایک نام پپیہے کی بول کی طرح میرے دل میں چکر لگاتا تھا بانکے بہاری نانکے بہاری چڑیاں ڈال ڈال پھدک پھدک کر یہی نام لیتی تھیں پتے ہوا سے ہلتے تھے تو یہی نام کہتے تھے ہوا جب درختوں میں سے گزرتی تو یہی آواز آتی تھی اور پھر چمپا چمپا جانے کون پکارتا تھا؟

میلا ختم ہو گیا تھا پر ارجن بھی بہت کمزور تھا بوا کچھ دنوں اور رک کر اپنے باقی بچوں سمیت چلی گئیں صرف بانکے بہاری اور اس کی بیوی رکے رہے۔ وسنتی کا بھیا میری طرف دیکھ کر سوچنے لگا تھا اسے کیا ہو گیا ہے وہ میرے پاس بیٹھا رہتا اور میں اس سے بات نہ کرتی۔ جب وہ کچھ کہتا تو یوں چونک کر اس کی طرف دیکھتی جیسے جانے وہ کون ہو اور مجھ سے اسے کیا کہنا ہو۔ میرے پاس کیوں بیٹھا ہو۔ پھر اس نے سوچا میں بس یونہی اداس ہوں اور ماں کے جانے کے بعد گھبرا گئی ہوں۔ تب پہلی بار اپنے رسم و رواج بھول کر اس نے کہا۔

"چمپا اگر تم جانا چاہو تو تھوڑے دنوں کے لئے مائکے ہو آؤ۔ تمہارا رنگ یوں پیلا پڑتا جا رہا ہے۔ جیسے کوئی بڑا دکھ اندر ہی اندر تمہیں کھائے جا رہا ہو۔ مجھے کیوں نہیں بتاتی ہو۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہارا دکھ دور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اور پہلی بار میں نے جانا کہ یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے اگر وہ اپنی اچھی صورت کے ساتھ دیوتا بنتا تو۔ پر لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ مجھے اس پر بڑا ترس آیا وہ میرے لئے آپ اتنا دکھی ہو رہا تھا

وہ میرے لئے ایسی ساری باتیں کرنا چاہتا تھا جو اُن کے خاندان میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ ان دنوں میں پدمنی کو بھی بھول گئی وسنتی کو بھی بھول گئی۔

جب بانکے بہاری نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے وہ شام بادلوں کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی اور بارش سے بھیگی ہوئی تھی۔ میں پشمینے میں لپٹی تکئے سے ٹیک لگائے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اور باقی سب لوگ ارجن کے پاس تھے۔ وسنتی بھی اپنے کمرے میں باندیوں کے ساتھ کہانی کہہ رہی تھی۔ بجلی جب چمکتی ہوگی تو بچہ ڈرتا ہوگا ارجن کے رونے کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی میرے پتی ابھی مندر سے لوٹ کر نہیں آئے تھے میرا خیال تھا جیسے پوجا ابھی ختم نہیں ہوئی ہوگی۔ میں آگ کے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو لوہے کو بھی سرخ کئے دیتے تھے اور مانو پگھل رہا تھا۔ ان کے ساتھ بہنے والا تھا۔ دیئے کی لو بڑی مدھم تھی اور آگ کا عکس میرے چہرے پر پڑ رہا تھا مجھے اپنی آنکھیں جلتی ہوئی لگتی تھیں۔

کسی نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا بھابی کیا گھر میں امرت دھارا ہوگا۔ ارجن روئے جاتا ہے جب میں نے منہ پھیر کر دیکھا ہے تو بانکے بہاری تھا۔

باہر ہوا ایک بین کرنے والی آواز سے چل رہی تھی۔ اور کھڑکی میں سے جو بادل مجھے دکھائی دے رہے تھے وہ آگ کے رنگ کے تھے آکاش پگھل کر ان میں ملتا ہوا لگتا تھا۔ سورج اب ڈوب رہا تھا۔ یہ پہلی گھڑی تھی کہ ہم دونوں اکیلے ملے تھے۔ میں اٹھنا چاہتی تھی اور اُٹھ نہ سکتی تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی اس نے گھبرا کر پھر کہا بھابی منا رو رہا ہے اگر امرت دھارا ہو تو دے دو۔"

دوسروں کے سامنے ہم نے آج تک کوئی بات نہ کی تھی میرا کیسا کیسا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بولے کچھ تو کہے اور آج جب ہم آمنے سامنے تھے تو سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیا بات کر سکتی ہوں۔ جانے اُس نے ندی کنارے بیٹھی اس رنگین شام والی لڑکی کو پہچانا بھی تھا کہ نہیں۔؟

اتنے میں ارجن بہت زور سے چیخا اور بانکے بہاری بھاگ کر میرے جواب کا انتظار کئے بنا کمرے سے باہر نکل گیا مجھے بہت دکھ ہوا۔ آج جنموں کے بعد ہم اکیلے ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے اور آج اُسی گھڑی وہ میری پرواہ کئے بنا جب کہ میں اپنا دل اس کے قدموں میں ڈالنے والی تھی بھاگ کر چلا گیا تھا جیسے اور دنیا وہ بچہ وہ بیوی اس کے لئے سب کچھ ہوں اور میں جس نے زمانوں اس کا انتظار کیا تھا اس کی کچھ نہ تھی۔ من جب اتو کھی باتوں سے دکھی ہونے لگتا ہے تو اُسے کون سمجھا سکتا ہے۔ مورکھ من! میری آنکھیں دکھ کے آنسوؤں سے بھر گئیں اور میں روتے روتے تکئے کے سہارے گر گئی۔ میرے لئے کوئی امید نہ تھی۔ بانکے بہاری کو میرے دل کی ذرہ برابر بھی خبر نہ تھی میرا پتی اندر آیا ہے تو میں بے سُدھ پڑی تھی۔ اس نے مجھے پکارا مجھے ہلایا اور جب وہ گھبرا گیا تو اس نے وسنتی کو آوازیں دیں۔

میں ایک روگی کی طرح بستر سے لگ گئی اور دیئے کی بتی کی طرح گھٹنے لگی بہو اور بانکے بہاری دونوں میرے

پاس آکر بیٹھے رہتے۔ تارا بڑے پیار سے میرے ہاتھوں کو دباتی اور مجھے کہتی بھابی تمہیں کیا ہے تم روز بروز گھلتی کیوں جارہی ہو۔ بانکے بہاری کہتا" جب ہم آئے تھے بھابی تو آپ اچھی بھلی تھیں اب اتنے تھوڑے دنوں میں آپ کی صورت بدل گئی ہے۔"

تارا اتنی سندر تھی جیسے چاند ہو۔ بالکل دیوی کی سی موہنی اس کے چہرے پر تھی جب ہنستی تو میرا دل چاہتا اُسے اپنے دل کے ساتھ لگالوں۔ بانکے بہاری اس کی صورت کو دیکھ کر جیتا تھا۔ باہر سے آتا تو تارا تارا پکارتا ہوا۔ یوں ایسا اوچھا بھی نہ تھا۔ مگر تارا میں اس کی خوشی تھی۔ جیسے چاند اور چکور ہو۔ میں لیٹے لیٹے یہ سب دیکھتی اور میری آس ٹوٹ جاتی۔ کیا ہی اچھا ہو یہ دونوں چلے جائیں تو!"

پھر میری بیماری بڑھتی گئی اور وہ دونوں چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ تارا مجھ سے مل کر جاچکی تھی اور اب کمرے میں سے سامان اندر بھجوا رہی تھی۔ بانکے بہاری جب مجھ سے وداع ہونے آیا ہے تو میں دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھی اور رو رو کر میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ہچکیوں سے میرا جسم ہل رہا تھا۔ جب اس کے بلانے پر بھی میں نہ بولی تو اس نے مجھے ہلا کر کہا۔

"بھابی بھابی۔ آخر آپ کو کیا ہے۔ کیا آپ کا جی بہت ماندہ ہے۔ میرا جسم اس کے ہاتھ کے نیچے پگھل کر پانی بن گیا۔ جیسے وہ سورج تھا اور میں ایک قطرہ جیسے وہ آگ ہو اور میں چنگاری۔

دکھ میں آنند ملا تھا میں نے دیوار کی طرف منہ کئے کئے اپنے کندھے پر پڑے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دیا جو کانپ رہا تھا اور رگوں کی ساری آگ زندگی کی ساری تمنا انگلیوں میں سما گئی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے جلتے ہوئے ہاتھ کے نیچے ٹھنڈا ہوتا جارہا تھا اور یوں زمانے بیت گئے۔

بیساکھ آگیا تھا جب میں لوٹ پوٹ کر تندرست ہوئی ہوں۔ فصلیں کٹ گئیں تھیں اور دور دور تک سنہرے ڈھیر کھیتوں میں تھے۔ ہوائیں دیوانوں کی طرح درختوں میں ناچتی ہوئی چلتیں اور مندروں میں چڑھاوے چڑھانے والوں کی بھیڑ رہتی۔ ڈھول بجتے رہتے اور لوگ مست ہوکر دیوی ماں کی استتی گاتے۔ میں ان ساری آوازوں کو سنتی جو اپنی گہری گونج کے باوجود صرف میرے کانوں سے ٹکرا سکتیں تھیں۔ اندر میرا من یوں تھا جیسا جاگ کر پورے ہوش میں نہ آیا ہو۔ وشنتی کہتی بھابی یہ تمہاری صورت ایسے کیوں ہے جیسے آدمی سپنا دیکھ رہا ہو تم کون سپنے دیکھتی ہو جبکہ میرا بھیا بھی تمہارے پاس ہے مجھے یوں لگتا ہے مانو تم ایک پری ہو جو ہمارے گھر جانے کیسے آگئی ہو اور جب تمہیں وقت ملا تم پنکھ پھیلا کر اُڑ جاؤ گی" پھر ہم دونوں ملکر ہنسنے لگتے اور ریدمنی بھی کھیلتی ہوئی کہیں سے آکر ہمارے ساتھ مل کر یونہی ہنسی خوشی روشنی ہے جو ایک دوسرے چہرے پر پھیلتی ہے جیسے دیئے روشن ہوجائیں۔

وقت ایک ایسے جنگل کی طرح میرے سامنے پھیلا تھا جس میں سے نکلنے کا راستہ میری آنکھیں ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں اور پا نہ سکی ہوں۔ بانکے بہاری میرے دل کا حال جانتا تھا پر اس سے کیا ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے

اُسے میری کوئی پرواہ نہ ہو میں صرف اس کی بھابی ہوں اس کے بھائی "چندر شیکھر" کی بیوی۔
دن لمبے ہوتے جاتے تھے اور ہوا کے ساتھ سفید روئی کے گالوں کی طرح چھوٹی چھوٹی جانوں کے قافلے میرے سر کے اوپر سے گزرتے رہتے۔ ایسی دوپہر میں جب نیند آنے لگتی ہے۔ رہٹ کی آواز میں ساری دُنیا کے ساز بجتے اور میرا دل چاہتا پر لگا کر اڑ جاؤں۔

مہاتما نے کہا تھا تمہارے من میں جوت جلے گی۔ مگر یہ جوت کیسی تھی کہ اس کی روشنی نہ اندر تھی نہ باہر جو ہر کسی تک بھی پہنچ نہ پاتی تھی۔ آموں کے بور کی خوشبو مدھم پڑتی جاتی تھی اور باغ میں کوئلیں شور مچاتی رہتیں سویرے میرے سپنے انہی کے بولنے سے ٹوٹتے۔ میں اپنے سینے کو پکڑ کر بیٹھ جاتی دل باہر نکلنے لگتا۔ کون جانے کن اتنے دکھ سے کیوں روتی ہے؟

" چندر شیکھر" اگر کبھی بانکے بہاری کا نام لیتا تو میرا دل یونہی دھڑکنے لگتا۔ سارا جہاں بس اسی دھڑ کی تال پر مجھے ناچتا اور رکا ہوا لگتا تھا اور پھر سب سے زیادہ ڈر مجھے اس بات کا تھا اگر "چندر" کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا اس کی دیوانی چاہت کا کیا بنے گا۔ وہ کیا کہے گا۔ شاستروں نے مجھے اس کی پتنی بنایا تھا اور میں ایک پتی ورتا عورت نہ تھی۔ میں شروع سے ایسی نہ تھی۔ پھر ایسے ہی ان گنت دکھ میری جان کو روگ بن کر آن لگتے۔ دریا کے گھاٹ پر مندر کی سیڑھیوں پر بولتے اور چلتے لوگوں سے ملتے برادری کی عورتوں میں مل کر بیٹھتے اشنان اور پوجا کے سمے میں ایک ایسے چور کی طرح تھی جس کو کسی گھڑی بھی اپنے راز کے کھل جانے کی فکر ہو۔ دیوی کے سامنے جانے سے ڈرتی دیوی ماں تو دلوں کا حال جانتی ہے اور دیوی ماں یہ بھی جانتی ہے کہ میں نے بانکے بہاری کیلئے اپنا آپ تج دیا ہے۔ میں پھر بانکے بہاری کو کب دیکھوں گی؟

وسنتی باتیں کرتے ہوئے کہتی تارا بھابی کتنی سُندر ہے مانو چاندنی ہو۔ جب ایسے چہروں کو دیکھو تو دنیا بڑی پیاری لگنے لگتی ہے جی چاہتا ہے بس جیئے چلے جائیں اور پھر بھیا بہاری ہے کتنا اونچا اور سُندر ہے دیوتا لگتا ہے۔ میرے بھیا سے بھی نکلتا قد ہے۔ بُوا کے سارے بیٹوں میں سے وہی سب سے بانکا ہے۔ جب میں بہت چھوٹی سی تھی اور ماں زندہ تھی تو ہمارے بابا کے پاس رہا کرتا تھا۔ پھر ماں اور بابا دونوں چلے گئے اور بُوا اب بوڑھی ہو گئی ہیں کم کم ہی آتی ہیں اُن دنوں ہمارے گھر میں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اب مجھے بہاری بھیا کے سامنے آتے لاج آتی ہے ان دنوں وہ مجھے اٹھا کر گھوما کرتے تھے اور میں ان کو کتنا تنگ کرتی تھی۔ بھابی تب یہ مندر اور گھاٹ اور یہ گاؤں بہت آباد تھا۔

مجھے ہر اس شے سے جو بانکے بہاری چھو چکا تھا لگاؤ تھا پھر وسنتی سے کیوں نہ ہوتا۔ وسنتی یوں ہی بڑی پیاری لڑکی تھی پھر اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں ہی تو تھے۔

پوربی ہوا چلتی تو میری کھڑکی کے کھلے پٹ یوں بجتے جیسے دو بچھڑی روحیں آپس میں گلے مل رہی ہوں میں بازو کھول دیتی اور میرا جی چاہتا ہوا کی یہ ساری شوخی اور تیزی اپنے میں بھر لوں۔ اور ان ساری خواہشوں

اور خیالوں کے اوپر میرے کان ان قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار رہتے جن میں میرا دل تھا۔ ساری دنیا وہی تھی کہ ایک دل کے بدلنے سے سب کچھ اور گیا تھا۔ پھر گرمیاں آئیں اور سنسناتی ہوئی دوپہروں کے ساتھ گزر گئیں۔ برساتیں ہوئیں اور برہا کی ماری کا دل ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ برکھا اور بادلوں کے گھنیرے میں رنگوں اور درختوں کی ہریالی میں میں نرک کی اس آگ میں جلتی رہی جس سے مجھے کبھی چھٹکارا ملنے والا نہیں تھا۔

جب وسنتی کی منگنی ہوئی ہے تو اور لوگوں کے ساتھ بانکے بہاری بھی آیا۔

گھر عورتوں سے بھرا تھا اور بہت بھیڑ تھی۔ گاتی ہوئی عورتیں سنگار خوشبوئیں اور پھر سکڑی سمٹی دالان کے ایک کونے میں گاؤں کی لڑکیوں اور برادری کی باسیوں اور چاچیوں سے گھری وسنتی بیٹھی تھی۔ "چندر شیکھر نے اس سے پہلے اس بات کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جب کیا ہے تو مجھے ہوش کہاں ہوگا کہ میں یہ کہہ سکوں کہ وسنتی سے پوچھ لیا جائے بھلا کسی نے کبھی لڑکیوں سے بھی پوچھا ہے کہ تمہاری مرضی کیا ہوتی ہے۔"؟

رسم ختم ہوئی ہے تو بھیڑ ہولے ہولے چھٹ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ منزل سامنے تھی اور میں وہاں تک پہنچ نہ سکی تھی اور میں بہت اداس تھی۔ پرانی بیماری پھر سے مجھے آتی جان پڑی۔ میں سارا سارا دن دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی رہتی اور اس ہاتھ کی منتظر رہتی جو میرے کندھے پر پڑے گا اور میرے ہاتھ کی گرمی کے نیچے ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میری رگوں کی وہ اینٹھن پانی بن کر بہے گی اور میرا سارا وجود اس کے قدموں میں ہوگا جسے شاید ان سب کی ضرورت بھی نہ تھی۔

بہاری کی اور میری دوسری ملاقات بالکل اچانک ہوئی۔ وسنتی پوجا کے لئے مندر گئی ہوئی تھی اور میں اپنے کمرے میں رنگوں کی پٹاری میں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی شاید وسنتی نے کچھ کہا ہوگا کہ وہ باہر کھنکارا اور پھر دالان کو پار کر کے دروازے کے بیچ میں کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں کے وہیں رک گئے اور ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گئے۔

اس نے دوبارہ کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور کہنے لگا "بھابی میں وداع لینے آیا ہوں۔ آج اپنے گاؤں جاؤں گا تارا کو کیا کہوں وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔

میرے کانوں میں اس کی آواز میٹھے مدھر راگ کی طرح پڑ رہی تھی جو مجھے سلا ہی تو دے گا۔

اس نے پھر کہا میں نے سوچا بھیا سے وداع لینے سے پہلے وداع ہولوں۔ تم بیمار تھیں جب ماں گئی ہیں تمہارا حال بھی بہت پوچھ رہی تھیں جس دن سے میں آیا ہوں اس بھیڑ بھڑکے میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس سے کہتی بیٹھو تو جاؤ۔ وہ وہیں دہلیز پر کھڑا تھا اور باقی ساری دنیا کے اور میرے درمیان تھا۔ اور پھر مجھ سے بہت دور تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ صرف ایک اندھا بے نام زور تھا جو یہ کہہ رہا تھا اگر اب کے

بھی بہاری سے کچھ کہہ نہ سکیں وہ کچھ سُن نہ سکا تو ساری عمر روتی رہو گی۔ ہر روز وسنتی کی منگنی تو نہیں ہو گی۔ روز تو پھول نہیں کھلیں گے۔ یہ رُت سدا تو نہیں رہے گی۔

ہوتے ہوتے میں نے اپنی پوری طاقتیں لگا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اس کی طرف دیکھا وہ ایک جادو کئے ہوئے انسان کی طرح وہیں دہلیز میں کھڑا تھا اور میری طرف دیکھتا جاتا تھا۔ میری ان نگاہوں نے مجھے کتنا ننگا کر دیا تھا اور پھر ان آنکھوں کی حیرت وہ بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھیں جیسے تصویر میں بھگوان کرشن کی ہوتی ہیں۔

پھر وہ مڑا اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کچھ کہہ سکتی لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پار کر کے باہر چلا گیا۔

میں نے منہ کو ہاتھوں میں چھپا لیا اور رنگوں کی پٹاری پر گر کر زور زور سے سسکنے لگی۔ بھگوان یہ میں نے کیا کر دیا تھا۔ کیا چاہت کا یہی مطلب ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے قدموں میں گرا دیا۔ عورت کی شان اس کا مان پوتر تا۔ ہائے مجھے لاج نہ آئی جانے بہاری کیا کہتا ہو گا۔ اب تو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ ورنہ وہ یوں بھاگ کیوں جاتا۔ اسے مجھ سے سخت نفرت تھی۔ بھگوان اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں یوں تڑپ رہی تھی جیسے مجھے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

بھاگتی ہوئی وسنتی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی اس کے پیچھے باندیوں کی قطار تھی سارے پریشان چہروں کے درمیان میرا من میرے ہاتھ سے چھوٹا جاتا تھا۔ شرم اور بے عزتی کے خیال سے میرا جسم پانی ہوا جاتا تھا کیا ہی اچھا ہوتا میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ بھگوان یہ کیسی جوت تھی جو میرے من کو کبھی روشن نہ کر سکے گی۔ بھگوان کیا تو دیا نہیں کر سکتا۔

پدمنی رو رہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اپنے ایسے جنم میں تھوک دوں اس گھڑی پر ہزار پھٹکار جب میں پیدا ہوئی ہوں خاندان کا نام لاج اور شرم۔ ارے میں کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ ایسی عورت کے لئے تو موت سے زیادہ بہتر شے نہیں۔

سارا دن گزر گیا شام آ گئی "شیکھر" میرا دل بہلاتا رہا وید جی نے طاقت کی کئی دوائیں دیں۔

۵

رات قریب آئی تو مجھ میں نئی طاقت آ گئی۔ پدمنی کہانی سُنکر سو گئی۔ میں نے "شیکھر" سے کہا میرا جی چاہتا ہے مندر جاؤں۔ وہ حیران ہو کر بولا "ویسے تمہارا جب جی چاہے تم ضرور جاؤ۔ مگر رات اندھیری ہے تمہیں ڈر نہیں لگے گا کہو تو میں ساتھ چلوں"۔ اور میں نے بڑے رسان سے اس سے کہا" تم بھی بس ایسے ہی ہو مندر کون سا ایسی دوری پر ہے اور پھر جہاں دیوی ماں ہو وہاں ڈرنے کی کیا بات ہو گی تم سارا دن کے تھکے ہوئے آرام سے سو جاؤ۔ میں کسی کو بھی نہیں لے جانا چاہتی میں آج تن اور من لگا کر پرارتھنا کرنا چاہتی ہوں تاکہ یہ جو

روز روز مجھے بیماریاں آگھیرتی ہیں اُن سے چھٹکارا ملے۔ تم پریشان ہوتے ہو تو میں اور بھی پریشان ہوں۔" اور پھر میں نے جھک کر اس کے ماتھے کو چُوم لیا۔

بہت دنوں کے بعد میں نے اتنا دل لگا کر اور پیار سے اس سے بات کی تھی اس لئے وہ بہت خوش تھا۔ پھر میں نے پدمنی کو پیار کیا اور جاتے ہوئے "شیکھر" کے پاؤں اپنی آنکھوں سے لگائے وہ اُٹھ بیٹھا اور بولا چمپا آج تمہیں کیا ہوگیا ہے لگتا تم بہت نراش ہو مجھے تو بتاؤ کیا بات ہے۔ تم یوں کیوں کر رہی ہو مانو آخری بار ہو۔ نصیب میں جو بدا ہے وہی ہوگا۔ پر جب تک میں زندہ ہوں تم مر نہیں سکتیں تمہیں کیا ہے۔ ضرور جاؤ اور دیوی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر جی بھر کر پرارتھنا کرو۔ بھگوان جانتا ہے میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آس یہی ہے۔ تم تو میرے ہردے کی روشنی ہو۔ تم میری پدمنی کی ماں ہو تم میری ساری دُنیا ہو"

اس رات میں نے پورا پورا سنگار کیا تھا۔ اپنا سب سے بڑھیا جوڑا نکال کر پہنا تھا۔ زیوروں سے لدی آخری بار جب دیئے کی لَو میں میں نے آئینہ دیکھا ہے تو میں خود حیران تھی۔ میں تو مرنے جا رہی تھی۔ شرم کے بوجھ تلے دبی میں تو آخری گھڑی دیوی کے قدموں میں جان دینا چاہتی تھی۔ اور یہ سنگار کیسا تھا جیسے میں بہاری کو ملنے جا رہی ہوں۔ بہاری کا نام سویرے کے بعد اب میرے من میں آیا تھا جیسے کوئی رات کا مسافر سب سے آخر میں آئے اور دوار کھٹکھٹا کر تھکا ہارا اندر آتے ہی سو جائے۔ پھر اس نام کے تال اور سُر پر جیسے میرے قدم ناچتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھال میں دیئے جلائے اور پھول رکھے میں اکیلی مندر کی طرف چلی۔ پلو میں بندھی زہر کی پڑیا کو رہ رہ کر میں ٹٹول رہی تھی۔

میرا دل کہتا تھا تم ایسی دلہن بنی ہو جو پہلی بار اپنے پریتم سے ملنے جا رہی ہو۔ تم رادھا ہو جو اندھیرے میں اپنے کرشن سے ملوگی۔ تم رگنی ہو جسے چرانے وہ آپ آئے گا۔ اور مرنے والے کی طرح نہیں زندگی میں پہلی بار داخل ہونے والوں کی طرح میرے قدم ہلکے اٹھ رہے تھے۔ ساری دنیا مجھے اپنے گرد ناچتی لگتی تھی۔ ہواہیں ایسی سنسناہٹ تھی جو خوشی کا گیت سا ہو۔ ہے بھگوان کیا بہاری چلا گیا تھا —— بہاری۔ بہاری۔ بے وقت کوئل جانے کیوں بول رہی تھی؟

مندر میں دیا مُند مُند جل رہا تھا۔ میں نے تھال رکھ دیا اور پھول دیوی کے چرنوں پر چڑھا دیئے۔ اتنے دیئے جلنے سے روشنی زیادہ ہوگئی تھی۔ دیوی ماں مجھ سے اونچی تھی اور اندھیرے سے ملی روشنی میں مجھے اُس سے ڈر بھی لگتا تھا پر ڈر کس بات کا تھا۔ یہ میری زندگی کی آخری رات تھی۔ میں ان چرنوں میں جھکی دیوی ماں سے زندگی کی نہیں موت کی بھکشا مانگ رہی تھی۔ دیوی اگر پریم کرنا اگر کسی کی آشا کرنا اتنا ہی برا ہے تو میں جینا نہیں چاہتی ہر دن میرے لئے مصیبت تھا۔ اور ہر گھڑی میرے لئے عذاب۔ ایسے انسان کی طرح جس کی جان بس ہونٹوں پر اٹکی ہو۔ دیوی ماں لوگ تجھ سے جینے کی بھکشا مانگتے ہیں میں تجھ سے موت کی دکشنا لینے آئی ہوں۔

دیوی ماں مجھے طاقت دے۔ دیوی ماں مجھے شکتی دے۔ شکتی دے۔

اس گھڑی مجھے ماں یاد نہیں آئی۔ مجھے کندھے پر اٹھانے والے بابا یاد نہ آئے۔ پلو پکڑ کر پیچھے بھاگنے اور چمپا کہنے والا بھیا یاد نہ آیا۔ سکھیاں اور سہیلیاں نہیں۔ پدمنی اور "شیکھر" کوئی بھی میرے ذہن میں نہ تھا بس ایک خیال تھا کہ آج میری آنکھوں میں میرے تن کی بھوک کو بہاری نے جان کر بھی مجھے دھتکار دیا ہے اور سوائے مرنے کے میرے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ موت میرے سارے دکھوں کا انت تھی۔ میرے سارے کشٹ دور ہو رہے تھے تو مہاتما نے یہی کہا تھا کہ میراتی اور میری پدمنی مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ پتہ نہیں اب میں کہاں اور کس صورت میں جنم لوں۔ مجھے مکتی کبھی نہیں ملے گی —— دیوی ماں مجھے شکتی دے میں جینا نہیں چاہتی مجھے موت دے۔

پھر میں نے اُٹھ کر دیئے بجھا دیئے۔ باہر چاند کی روشنی تھی جو بڑے دروازے کی دہلیز پار کر کے اندر آنا چاہتی تھی۔ پر ایسی رات جب موت اندر ہو اور ہم کے دوت دوار میں کھڑے ہوں۔ چاندنی بھی اچھوت کی طرح باہر بھٹکتی رہی۔

دیوی ماں کے چرن چھو کر میں نے پلو کے اس کونے کو ہاتھ میں پکڑا جس میں زہر تھا۔ پھر میں نے ایسی آواز میں جو مندر میں گونج گئی۔ کہا۔ "دیوی ماں تو گواہ ہے میں لاج شرم اور پوتر تا کے لئے مر رہی ہوں۔ تاکہ میرے من کو ایسی بیماریاں نہ لگیں جو پتی ورتا استری کے سہارے سے باہر ہوں۔ بھگوان تو میرے اِس بلیدان کو سویکار کرے" میری انگلیاں ہولے ہولے گرہیں کھول رہی تھیں اور میں دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی تھی۔ دیوی کے قدموں کے پاس صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ پڑیا کو کھولتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ گئے۔ میں نے سوچا باہر کتنی نرم چاندنی ہے اور ہوا ہے۔ اور ساری دُنیا جو مجھے پیاری تھی وہ نظارے جو مجھے سہانے لگتے تھے وہ سب اس ایک پڑیا کے بدلے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ پھر بُوا کو پتہ چلے گا اور پھر بہاری اور تارا آئیں گے اور کہیں گے چمپا بھابی نہیں رہی اور شاید بہاری کو دکھ ہو۔ شاید بہاری میرے لئے ایک آدھ آنسو بہائے۔ زندگی بڑی پیاری چیز ہے۔ میری انگلیاں پڑیا پر بہت بے جان سی تھیں اور کاغذ کھولے نہیں کھل رہا تھا۔ جب میں نے پڑیا کھول لی ہے اور منہ اونچا کر کے اُسے اپنے حلق میں گرانے لگی ہوں تو کسی نے ہاتھ مار کر زہر گرا دیا اور پھر دیا بھی بجھ گیا۔

بس سسک رہی تھی اور میرے من میں دیوالی ہو رہی تھی۔ اس چوڑے سینے میں سمانے کے میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے ہونٹ میری باہیں اور یہاں تک کہ میرا دل بھی گھل کر اس گرم دھارے میں مل گیا جو زندگی تھا۔ دیوی ماں نے مجھے دکشنا یوں دی تھی کہ مجھے میرا اپنا آپ بھی لوٹا دیا اور وہ بھی جس کی مجھے آشا تھی۔ شرم لاج اور گھونگھٹ جانے کہاں تھے۔

ایک مدھر سپنے میں دیکھی صورت کی طرح کوئی کہہ رہا تھا۔ سولہ سنگار کئے تم موت سے ملنے کہاں جا سکتی تھیں۔ موت میں کب اتنا بل ہے کہ سندرتا کو جیت سکے۔ یہ سپنوں کی سی رات ہے اس رات میں بھگوان ملتا ہے بھگوان جو آپ پریم ہے جو آپ سندرتا ہے۔

میں کب تک تمہارا انتظار کرتا۔ چمپا میں کب تک تمہاری راہ دیکھتا۔

جب میں گھر لوٹی ہوں تو آکاش پر اندھیرا اُجالے میں ملنا چاہتا تھا۔ سوئے ہوئے کھیت شانتی ہی شانتی صبح کا تارا شانتی تھا۔ اور میرا مسلا ہوا سنگار، میری مسکی ہوئی چولی میرے گھنیرے اور کھلے بال میری چوری کی نشانی تھے۔ ہر طرف شانتی تھی۔ تو دھنیہ ہے دیوی ماں۔ تیرا مندر پریم کا مندر ہے۔

ارے اب ان بوڑھی رگوں میں کیا رہا ہے۔ اب دیوی سے کچھ بھی مانگوں تو کبھی نہیں ملے گا۔ میں نے تو سب کچھ مانگ لیا تھا اس ایک رات میں اس نے مجھ پر ہر شئے کی بارش کر دی تھی۔ اس برکھا میں نہا کر میرے بدن سے سارا میل میرے من سے ساری دکھن اور میرے انگوں کی ساری پیڑا دھل گئی تھی۔ میں پریم رنگ میں رنگی ہوئی اتنی پوتر تھی جیسے ابھی پیدا ہوئی ہوں۔

۶

وہ جیون جو اس رات کے بعد سے مجھے ملا ہے اس پر سوائے بہاری کے کسی کا ادھیکار نہ تھا وہ جیون اس نے بچایا تھا۔ دیوی ماں کے سامنے موت کے ہاتھوں سے یہ جیون اس نے چھینا تھا۔ یہ اس کی شکتی تھی جس سے یم کے دوت بھی شکست کھا کر لوٹ گئے تھے اور بھگوان جانتا ہے اس رات کے بعد سے میں نے سوائے بہاری کے کسی کو اپنا نہیں سمجھا اگر دیوی چاہتی تو مجھے شیکھر لوٹا سکتی تھی۔ اگر دیوی کی آشا ہوتی تو۔ پر جو اندھیرے میں ہے اُسے سوائے بھگوان کے کون جانتا ہے۔ میں اور تم اور مہاتما سب اندھیرے میں ہیں زندگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرے کا سفر ہے۔

جب میں نے آئینہ دیکھا ہے تو دیکھتی رہ گئی۔ اور پھر میں نے گھبرا کر آئینہ پرے سے پھینک دیا۔ کپڑے بدل بدل کر پدمنی کے پاس آئی ہوں تو وہ جاگ رہی تھی اس نے اپنی باہیں اوپر اٹھا دیں اور میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "شیکھر" سویرے کی پوجا کر کے مندر جا چکا تھا۔ میری آنکھوں میں سپنوں اور پریم کے رنگ ملے تھے وسنتی نے دیکھا تو کہنے لگی "بھابی تم رات ہی رات میں بدل گئی ہو مانو تمہیں نیا جیون مل گیا ہو۔ کل تک تم اتنی پیلی تھیں کہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا اور آج تو تم نئے کھلے پھول کی طرح ہو۔ پھر اس نے جھک کر میرے کندھے سے اپنی ناک لگا دی اور کہنے لگی" ارے یہ نئی باس تم میں کہاں سے آئی ہے تم تو مہک رہی ہو" میں نے اسے کہا "ہٹ تجھے تو ہر گھڑی مذاق سوجھتا ہے۔ بھلا نئی مہک مجھ میں کہاں سے آئی۔ نہا کر آئی ہوں اس لئے

وسنتی نے سر ہلا کر کہا نہیں بھگوان کی سوگند اٹھوا لو۔ تم تو یوں نکھری ہو مانو ساگر میں سے نہا کر نکلی اندر کے دربار کی اپسرا ہو۔ ارے بھابی تمہاری آنکھوں میں یہ گلابی ڈورے کیسے ہیں۔ پھر وہ خوشی سے تالیاں بجا کر میرے گرد ناچتی رہی اور میں شرم سے لال ہو گئی۔

دوپہر کو "شیکھر" آیا تو کہنے لگا۔ چمپا تم تو اتنی سندر جان پڑتی ہو مانو دیوی ہو یہ ایک رات میں تم

کتنا بدل گئی ہو۔ تمہاری ساری بیماری کیسے دور ہو گئی ہے؟ میں کہتا ہوں تم روز رات مندر میں پوجا کرنے جایا کرو تو دیوی ماں تم پر بہت ہی کرپا کریں۔ میں کتنا خوش ہوں کتنا خوش۔" اور اس نے چاہا کہ میرا ہاتھ پکڑ لے مگر میں پہلو بچا کر ایک طرف ہو گئی اور پدمنی کو بازوؤں میں لے کر پیار کرنے لگی۔

پدمنی بھی میری اس اچانک تبدیلی سے بہت حیران ہو گئی۔ ایک وہ دن تھے کہ میں پہروں دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی رہتی اور کسی سے بولتی نہ تھی اب میرا دل ایک دم دنیا کے اتنے پیار سے بھر گیا تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے پریم دل کو بھی خیالوں کو بھی گہرائی دیتا ہے۔ میں آج تک کے اپنے اکھڑپن سے شرمندہ ہو رہی تھی مجھے "شیکھر کے پریم اور اس پیڑا کا جو اس کے پردے میں ہوتی ہو گی پہلی بار احساس ہوا بھوکے پیٹ آدمی کو صرف روٹی کے سپنے آتے ہیں اور جب پریم انتر میں روشنی کر دیتا ہے تو باہر بھی ہر شے رنگ اور نور میں ڈوب جاتی ہے۔

میں گھر میں ایک تتلی کی طرح گھومتی پھرتی اپنے نئے پن میں آپ ہی مگن وسنتی کے گلے لگتی۔ پدمنی کو چومتی "شیکھر" کو میں اتنے احسان کی نگاہوں سے دیکھتی اور باندیوں سے پہلے سے زیادہ رسان سے ملتی۔

ہر رات میرے لئے دیوالی کی رات ہوتی تھی۔ ہر رات مندر میں میرے لئے دن ہوتا تھا۔ اُجالے میں میں دیکھتی کہ بانکے بہاری مندر کے ساتھ والے ایک کمرے میں بیٹھا پوجا پاٹ کرتا یا شاستروں کو پڑھتا۔ "شیکھر" گھر آتا تو کہتا "چمپا بہاری کے لئے کھانا اچھی طرح بھیجا کرو بیچارا دن رات اتنی محنت کرتا ہے کہتا ہے مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

وسنتی کہتی۔ بہاری بھیا کبھی گھر میں کیوں نہیں آتے جانے کیوں اتنے بیگانے ہو گئے ہیں، باہر پڑے رہتے ہیں۔ بوا آئیں گی تو شکایت کروں گی کہ انھیں جانے کیا سیکھا کر بھیجا ہے کہ ہم سے ملنے نہیں آتے۔ کیوں بھیا بچے گودوں میں اٹھا کر گھوما کرتے تھے۔۔؟

شیکھر کہتا۔ میں تو کئی بار بہاری کو کہتا ہوں پگلے گھر چل آخر ایسا جتن اور اتنی تپسیا کرنے کا کیا فائدہ۔ ہر کام کے لئے وقت ہوتا ہے۔ تیرا ابھی مہاتما بننے کا وقت نہیں آیا۔

پھر اور باتیں ہونے لگتیں۔

میں بڑی بے تابی سے رات کا انتظار کرتی پہلے پہل تو شیکھر بہت خوش تھا کہ چلو کسی بہانے ہی سہی دیوی ماں کی سنگت میں ہی سہی چمپا کا دل تو بہلا چہرے پر کی وہ زردی اور بے رونقی تو دور ہوئی۔ ہر ایک سے اچھی طرح سے بولتی ہے گھر کے کاموں میں حصہ لیتی ہے۔ گاؤں والوں سے ملتی ہے۔ اس نئی چمپا کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ وسنتی سے کہتا "دیکھا دیوی ماں نے تیری بھابی کو کتنا بدل دیا ہے یہ سارا پوجا کا پھل ہے۔" اور پھر دیوی ماں کی استتی گانے لگتا۔

بہاری کہتا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو پر رات میں میری ہو۔ میں رات کو مندر میں دیئے جلاتی سیڑھیاں دھو کر دیوی ماں پر نئے پھول چڑھاتی اور پھر پوجا کرنے کے لئے بہاری کے قدموں میں

جھکتی کہ بہاری میرا دیوتا تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اسے دیکھ کر جیتی تھی۔ پر کبھی کبھار ایک خیال سوئے ہوئے ناگ کی طرح میرے دل میں سر اُٹھاتا، ہو سکتا ہے بہاری کی چاہت وقتی ہو اور میں جو اپنا آپ تج کر اس کے قدموں میں آن پڑی ہوں میں جس پر ترس کھا کر اس نے گرے پھول کی طرح مجھے دھول میں سے اٹھایا ہے کیا پتہ وہ کبھی مجھ سے اوب کر واپس تارا کے پاس چلا جائے۔ ان خیالوں کا ڈنک میری خوشی میں مانو زہر بنکر پھیلتا۔ پر یہ سارے خیال یہ ساری اداسیاں ایک لمحے کی دریا کی بڑی لہر کی طرح اس مدہوشی کا طوفان مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔

وہی راتیں ہیں جو میرے پاس باقی ہیں انہی راتوں کا تیل ہے کہ میری زندگی کا دیا جلانے کو صدیوں کافی ہوگا۔ بہاری کے بعد اگر میرے پاس سہارے کے لئے ان بیتی راتوں کی یاد بھی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جانے کیا ہوتا۔

اندھیرے میں تیز باس والے گلاب کھلتے ہمارے چاروں طرف جھنکار ہوتی اور مجھے لگتا ہم پر پھول برستے تھے۔ لوگ کہتے تھے ہم نے مندر کو بھرشٹ کر دیا ہے لوگوں کو جانے یوتر تاکس شے میں دکھائی دیتی ہے پریم سارے دھرموں سے اُتم اور ساری شرموں سے اونچا ہے اس کی پدوی تو آکاش میں ہے۔ اگر دیوی ماں کو یہ سب بُرا لگتا تھا تو ہم کو آپ مندر سے نکال سکتی تھی زمانے نے کبھی کسی کا ساتھ دیا ہے۔

بہاری کے بازو مجھے ستاروں کا ہنڈولا لگتے تھے اور رگھ میں تو ندی کا دھارا تھا جو اس کے قدموں میں بہتا تھا اس کی انگلیاں میری ساری سختیاں ساری کٹھورتا پگھلا دیتیں اور میں یوں بہنے لگتی مانو سورگ میں سے آئی جل دھارا ہوں۔

میں کہتی بہاری ایک دیا ہو تو اچھا نہ رہے اور بہاری کہتا تھا تمہاری آنکھوں کی جوت سے تو سارا جگ روشن ہے تم جو آپ روشنی ہو تمہیں دیو ں کی کیا ضرورت ہے۔

میں کہتی بہاری اندھیرا دشمن ہے اس سے ہوشیار کیوں نہیں رہتے اندھیرا سیاہ سانپ ہے کہ چپکے سے ڈس لیتا ہے۔

اور بہاری میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر کہتا۔ پر اندھیرا کہاں ہے یہ اتنی بڑی بڑی جوت بھری آنکھیں۔ یہ تمہارے بدن سے پھوٹتی کرنیں کیا ان سب کے ہوتے تمہیں اندھیرے سے ڈرنے کی ضرورت ہے کبھی ہم دیوی ماں سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھے رہتے ایک دوسرے میں مگن ایک دوسرے سے لگے ہوئے جیسے ہم میں کوئی دوسرا نہ ہو ہم ایک ہی ہوں اور پھر اندھیکار کے دھڑکتے دل سے ڈرتی میں سوچتی یہ سپنا کسی دن ٹوٹ جائے گا۔ اتنی بہت خوشی کا بوجھ سنسار نے کبھی اٹھایا ہے؟ دھرتی اس بوجھ سے پھٹ جائے گی۔ مگر ان سارے وہموں کو میں نے جھٹک کر کبھی بہاری سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں بہت دنوں شیکھر کو دھوکا دینے میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔

راتوں کو گھر سے میرا یوں مندر میں چلے آنا اور اندھیارے میں رہنا اس کی نظروں سے چھپا نہ رہے گا اور پھر بہاری کا بنا کسی کام کے یہاں رُکے رہنا۔ ہے بھگوان کیا بنے گا مگر چار گھڑی سے زیادہ یہ سوچ مجھے پریشان نہ کرتی۔

میری بدلی ہوئی نگاہیں میری چال جیسے کوئی سپنے میں چل رہا ہو۔ بوڑھی باندیوں کی نظروں سے کب تک چھپی رہتی میں گھر میں ہوتی تو دیکھتی باندیاں وسنتی کو لئے کونوں کھدروں میں باتیں کر رہی ہوتیں میری طرف دیکھتی ہوئی کئی بار وسنتی میرے پاس یوں آتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پر پلٹ جاتی۔ مجھے معلوم تھا وہ ان باتوں کا جھوٹ سچ جاننا چاہتی ہوگی جو باندیاں کہتی تھیں پر مجھے دیکھتی کہ اپنے میں مگن گیت گنگناتی ہوئی اُسکے جہیز میں دیئے جانے والے جوڑوں میں کناری ٹانک رہی ہوں اور بہت ہی مصروفیت سے کسی صندوق کو اُلٹ پلٹ کر رہی ہوں۔ اناج تلوا رہی ہوں۔ پھر اس کے بھائی کے کپڑوں میں پریم سے بٹن ٹانک رہی ہوں تو وہ میرے پاس کھڑی ہوئی بڑی محبت سے مجھے دیکھتی رہتی اور پھر میرے گلے میں باہیں ڈالکر کہتی "میری بھابی تو سچ مچ اتنی اچھی ہے اور اتنی سندر"

اور میں کہتی "کیوں وسنتی کیا تجھے یہ سب جھوٹ لگتا ہے مجھے تو تُو اپنی بہنوں کی طرح پیاری لگتی ہے تو تُو مجھے پدمنی سے بھی زیادہ پیاری ہے جب تو چلی جائے گی تو پھر جانے میں کیا کروں گی۔ تیرے بنا یہ گھر کتنا سونا ہوگا۔ تیری ہنسی کی جھنکار تیری آواز کی مٹھاس کہاں سننے کو ملے گی" بیاہ کی بات پر وہ شرما کر بھاگ جاتی۔

آج لگتا ہے سکھ تو ایک سپنا ہے سپنے میں دیکھے رنگ محل کبھی جاگنے میں دکھائی دیئے ہیں؟ وہ سب دنوں جب میں زندگی کے پیالے میں سے خوشی کا آخری گھونٹ تک پی جانا چاہتی تھی۔ اصل میں ایک سپنے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بہاری سپنے میں دکھائی دیا ایک جوان تھا۔ سپنا چاہے کتنا ہی لمبا ہو سالوں پر پھیلتا چلا جائے آخر سپنا ہے اور جب سونے والے کی آنکھ کھلے گی اور وہ ہوش میں آئے گا۔ تو سپنا ٹوٹ جائے گا۔

جس طرح اور سپنوں کے نصیب میں یہ ہے کہ وہ ٹوٹیں اسی طرح میرے نصیب میں بھی آنکھ کھول کر یہ دیکھنا بدا تھا کہ یہاں نہ بہاری ہے نہ مندر ہے۔ دیوی ماں کی مورتی بڑے دکھ سے اپنی ہنسی چھپائے ہوئے ہے اور بڑے لمبے ختم نہ ہونے والے دن ہیں جن میں کام ہے اور "شیکھر" کے نگاہوں کی بے یقینی ہے میں جب اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھتی تو میری رگوں میں خون کی جگہ برف ہوتی اور وہ جس نے کہا تھا کہ تم اندھیرے کی دلہن ہو کہیں نہ ہوتا۔ مندر میں دیئے جلا کر آنکھیں بند کئے سوچتی رہتی ہر آہٹ پر کان دھرے اپنے سارے جسم کو مانو کان بنائے پر کسی کونے میں سے کوئی نہ اٹھتا کہ اس زہر کو جو ہولے ہولے گھل کر میری رگوں میں پھیل رہا تھا ہاتھ مار کر گرا دے

آنکھ بند کئے میری جاگتی آتما بھکاری کی طرح اپنا کرمنڈل اٹھائے ایک کونے میں کھڑی تھی کہ کبھی تو وہ اِن راہوں سے گزرے گا۔

میری بھول یہ ہوئی ہے کہ میں نے اپنا وہ پھول جو مجھے اس کے قدموں پر سویکار کرنا چاہیئے تھا بچا کر رکھ چھوڑا تھا کہ اس کے ماتھے پر کے تاج میں سجاؤں گی۔ اس کے سر تک میرے ہاتھ پہنچ نہ سکے اور میرا پھول میرے ہاتھ سے گر کر دھول میں مل گیا۔ آج تک اس مٹی میں بھرے پھول کو دیکھتی ہوں اور افسوس میری نگاہوں سے آنسو بن کر بھی نہیں بہہ سکتا کہ یہ پھول کسی تاج میں نہ لگ سکا۔ میری بھول ہے اور بھگوان میری بھول کی سزا مجھے کتنی بڑی مل رہی تھی۔ میرا وہ پیالہ جس میں کبھی امرت تھا زہر سے بھرا ہے اور ہر روز مجھے اس پیالے میں گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا ہے اگر ایک ہی بار اس کو ختم کرسکتی تھی تو مگر نہیں مجھے یہ سب بھوگنا ہے کہ میں زہر بن کر جیوں اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ بہاری کے اور میرے درمیان کتنے جنموں کا فاصلہ ہے جس سے آگے اور پیچھے ہونے کی میری مجال نہیں۔

ہر ایک آدمی کے حصّے میں کچھ خوشیاں آئی ہیں اور کچھ رنج۔ میں نے اپنے حصے کی خوشیاں ان چند راتوں میں ختم کر دیں۔ پر یہ آج تک سمجھ نہیں آتا۔ ان راتوں میں یہ لگتا تھا کہ یہ خوشی میری باقی زندگی کے لئے کافی ہے۔ میں اسی خوشی کی خاطر کتنے نرک بھوگ سکتی ہوں۔ سارے سنسار سے مقابلہ کرسکتی ہوں۔ بھلا آج تک سنسار کے مقابلے پر کوئی ڈٹ کر جیت سکا ہے سب ہی گر گئے ہیں اور ہم دونوں بھی گر گئے۔

جب وسنتی کا بیاہ ہوا ہے تو تارا بھی آئی تھی اور بُوا کی بہوئیں بھی۔ تارا اس طرح پریم سے مجھ سے ملتی پروانوں کی طرح میرے گرد چکر لگاتی بھابی کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتی۔ پھر کاموں میں مگن اگر ان دنوں وہ میری مدد نہ کرتی تو میں شاید بُری طرح گر جاتی۔ بہاری کبھی اندر آتا بھی تو بس دو جملے تارا سے بات کرتا اور چلا جاتا اس کی آواز سُن کر میری رگوں میں ٹھنڈک سی بھر جاتی اور کبھا کبھی میں بھی ایسی گم سم ہو جاتی جیسے بیہوش ہوں۔ تارا کہتی بھابی بھلا یہ بوجھ کس طرح برداشت کرسکتی ہے اکیلی پر کتنا کام ہے۔ مہینوں سے کام کر رہی ہے۔ بیمار نہ ہوگی تو کیا ہوگا۔ شیکھر بھاگا ہوا آتا۔ جہاں سے ہوتا وہیں سے بلوایا جاتا۔ مگر میں بہت بیزار ہو جاتی۔ شادی کے کاموں میں لوگوں کی نکر میری وجہ سے اور بڑھ جاتی۔

ماں بھی آئی تھی بھیا اب لگتا تھا گبرو جوان ہے اسے دیکھ کر میرا جی بڑا اداس ہو جاتا کہ میں اس کی بہن ہوں اگر کبھی اسے پتہ چل گیا تو جانے کیا ہوگا۔ اسے کتنا برا لگے گا۔ میں بہاری سے لگ کر اپنے آپ کو دھرتی کا ایک ایسا ٹکڑا سمجھتی تھی جس پر بھگوان نے آپ پاؤں دھرا ہو۔ اور بھیا کو دیکھ کر میرا دل کانپ جاتا۔ صرف اسے دیکھ کر لگتا مندر میں دیوی ماں کے سامنے میں اور بہاری ڈاکوؤں کی طرح شیکھر کے حصے میں سے چراتے اور بھیا کی عزت میں سیندھ لگاتے رہے ہیں بھیا کو دیکھ کر مجھے کیوں ایسا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹا تھا پر میں اس سے ڈرتی کیوں تھی۔ وسنتی وداع ہوگئی تو مجھے گھر ایک دم بہت سونا لگنے لگا۔ مجھے معلوم تھا باندیاں جو باتیں کرتی تھیں صرف

وشنی ہی ان کا منہ بند کر سکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ دنیا کے اور میرے درمیان ایک حفاظت کی دیوار تھی۔ کمزور سی دُبلی کامنی لڑکی۔ اس نے بہت کچھ سننے پر بھی کبھی مجھے نہیں کہا تھا۔ سُنی سُنائی باتوں کو جھوٹ سمجھ کر ٹالا تھا۔ وہ طوفان کے آگے بندھ کی طرح تھی۔

ماں نے ایک دن بنّے الگ مجھ سے کہا" چمپا تجھے گھر کے سکھ اور اپنے من کے چین کی ضرورت نہیں تو کم از کم ہماری عزت کا خیال تو کیا کر۔ دنیا کی آنکھیں بٹیا کھڑکی کی طرح بند نہیں بہت کھلی اور تیز ہیں۔ تو نہیں چاہتی کہ میں یا تیرا بھیّا اپنا سر اٹھا کر چلیں۔ کیا تو چاہتی ہے کہ اس عمر میں تیرا بابا ڈوب کر مرجائے۔ اری چمپا ہوش میں آ۔ اگر تارا کو پتہ چل گیا تو کیا کہے گی۔ تیرا خیال ہے یہ باتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں کوئی تارا کو نہیں بتلائے گا۔ تو سوچتی ہے تیرے ڈر سے لوگ تیرا راز چھپا کر رکھیں گے تو یہ تیری بھول ہے۔ بیٹی لوگ تو بھگوان کا راز بھی کہہ دیں

میں سر جھکائے سُن رہی تھی۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کہتی گئی۔" کیا تو سوچتی ہے مندر کو بھرشٹ کر کے تو اور بہاری بچ جائیں گے۔ بھگوان کی سوگند تم پر دیوی ماں ضرور غصے ہوگی۔ اری تجھے لاج نہیں آتی تو ہم پر دیا کر آخری عمر میں ہمارے سفید بالوں میں کیوں کالک لگوائے گی۔ پھر تیرے اتنی سندر اور موہنی بیٹی ہے۔ آدمی کیا اپنے لئے ہی جیتا ہے تو میری بیٹی ہو کر ایسی ہوگی۔ تو نے میرا دودھ پی کر اتنا بڑا اپرادھ کیا" اور پھر رونے لگی میں اٹھ کر جانے لگی تو اس نے میرا پلّو پکڑ لیا اور کہنے لگی "چمپا تو شیکھر سے نہیں ڈرتی تو اپنے بھیّا سے ڈر وہ تجھ سے چھوٹا تو ہے پر بہت غصہ ور ہے۔ وہ تجھ سے روکے نہیں رُکے گا اور پھر نہ جانے کیا ہو جائے۔ اری میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے بتا تو سہی بہاری میں ایسے کیا لال لگے ہیں جو تو شیکھر کو چھوڑ اسے چاہنے لگی ہے۔ جس پتی نے بھگوان کے سمان تجھے سارے سکھ دیئے تو انھیں تج کر پاپ کے راستے پر کیوں چلنے لگی ہے۔ تجھ پر کس نے جادو کر دیا ہے۔ چمپا تیرا بھیّا جب سُن پائے گا تو وہ مجھ سے نہیں رُکے گا۔ پھر یہ نہ کہنا مجھے خبر نہ کی اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔ پھر اس نے طاق میں رکھی بھگوان کرشن کی مورتی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ بھگوان تو گواہ ہے میں نے اسے سب سے برا بھلا سمجھایا ہے۔"
اور مجھے لگا جیسے وہ بہاری کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو۔"

بہاری کی مسکان میرے ہردے میں تیر کی طرح اتر گئی۔ ٹکٹ لگائے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھنا بھگوان اور شیش ناگ نے میرے اندر گہرے سمندر میں زور سے پھنکار ماری۔ اتنی زور سے کہ میں ہل گئی۔ بہت دنوں سے میں نے بہاری کو نہیں دیکھا تھا۔ میں برہن تھی اور باغوں سے گھرے اور کوئل کی کوک سے بھرے اس گھر میں اکیلی تھی۔

باہر بسنت گانے والوں کی ٹولیاں تھیں اور مندر میں پچھلے سال سے بڑھ کر دھوم تھی۔ ہوا میں رنگ اور مہکار تھی۔ مست سادھو ناچنے والے اور بے سُدھ ہو کر گرنے والے بھگوان کے بھگتوں کی بھیڑ تھی۔ گھاٹ سے لیکر کھیتوں تک اور راستوں پر آموں کے بور کی باس سے پنچھی اور آدمی سب مست تھے۔ کنواریوں کی چنریوں میں

رنگ نکھرے ہوئے ان کے چہروں پر چمکارا اور ہنسی کی چھوٹ جیسے کرنوں کا دھارا بہے۔ بانجھی دن رات یاتریوں کو اس پار چھوٹ گیا اور ان کے گیت پانی کو چھو کر آکاش تک گونجتے ہوئے دھرتی نے نیا روپ بدلا تھا۔ درختوں کی چمکتی ہوئی نئی کونپلیں اور نکھرے ہوئے آکاش کے نیچے کروٹیں لیتی ہوئی زندگی پر ماں کو میں دیکھتی اداس سی جیسے ان چند دنوں میں مرجھا گئی ہو۔ بُوا وسنتی کے دربار سسرال جانے کے لئے رکی ہوئی تھی۔ رات آتی تو میں انگاروں پر لوٹتی جانے کب میں بہاری کو دیکھوں گی۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا اور اسے کسی جگہ بلوانا میرے لئے ممکن نہ تھا اور مندر کے اندر باہر اتنے لوگ تھے۔

کوئل آموں کی جھنڈ میں بولتی تو میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آجاتے۔ بہاری مجھ سے یوں آنکھیں چرا کر چلتا جیسے کبھی اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ اجالے میں میں ایسے نقطے کی طرح جو دھوپ میں مل گیا ہو اسے دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ تارا کتنی بھاگوان تھی جس کو ایسا دیوتا پتی ملا تھا اور جو اسے چاہتا بھی تھا۔ سورگ سے نکالے ہوئے کی طرح مجھے کسی طرح چین نہ آتا۔ بھیّا آکر بیٹھتا تو میں اس سے بھی دل لگا کر بات نہ کرتی۔

لوگ کہتے ہیں اس لئے اداس ہوں کہ وسنتی اب اس گھر میں نہ ہوگی۔

وسنتی سسرال گھر سے پہلی بار لوٹ کر آئی ہے تو بہت خوش نہ تھی ایسے بھکاری کی طرح جس کو بس پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو ملی ہو۔ اس کی کاجل سی کٹیل بنی آنکھوں میں بے رونقی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ جب تک آس ہوتی ہے انسان جئے جاتا ہے۔ پر جب آگے پیچھے کچھ نہ رہے اور جو ہو وہ تمہاری جھولی میں آن پڑے تو؟

دوسروں کے سامنے وہ بہت خوش رہتی۔ تارا بھابی سے گھُس گھُس کر باتیں کرتی پدمنی سے مل کر پینگ بڑھاتی اپنے لہریا دوپٹے کو جھٹکاتی وہ مجھے ایسی بہار لگتی جس کی آنکھوں میں ویرانی کا نقشہ ابھی سے جما ہوا اور میں دل ہی دل میں پرارتھنا کرتی بھگوان تو نے اس گھر میں کسی کے لئے شانتی نہیں لکھی۔ کیا ہم اپنی اپنی راہوں سے آپ مکتی کے لئے کھوج کریں۔ بھگوان تو ہم پر دیا کیوں نہیں کرتا۔ بھگوان!

سب لوگوں سے مل کر ایک رات جب شیکھر کسی کے یہاں پوجا میں گیا ہوا تھا اور تارا بُوا اور ماں کے ساتھ باتوں میں مگن تھی وہ میرے پاس آئی اور پہلے چپ چاپ بیٹھی اپنے پلو کو انگلیوں میں مروڑتی رہی اس کے اس کے بعد اٹھ کر میرے گلے سے لگ گئی اور ہچکیوں سے مجھے اس کا سانس رکتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

میں نے کہا وسنتی ارے ہوش میں آ تو رو کیوں رہی ہے ساری دُنیا کی لڑکیاں ماں کے گھر سے وِداع ہو کر سسرال جاتی ہیں کیا میں اس گھر میں ایسے نہیں آئی تھی۔

وسنتی نے کہا "بھائی تمہیں وہ گھاٹ والے مہاتما یاد ہیں انھوں نے ٹھیک کہا تھا۔" اور میں اسے کیا بتاتی کہ وہ مہاتما بھلا مجھے بھول سکتے تھے۔

میں نے کہا "ضروری نہیں کہ باغ میں جا کر پہلے ہی وہ سب پھول دکھائی دیں جو ٹوٹ کر جھول میں

گرنے والے ہیں"۔

اور وسنتی نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "کیوں بھابی اس بھیڑ اور شور میں ہماری بھیا سے تو ملنا ہوا نہ ہوگا؟"

جس پریم کو میں نے سالوں اپنا خون دے کر پالا تھا اس سے انکار کرنا میرے بس کی بات نہ تھی پھر وسنتی تو بہت کچھ جانتی تھی شاید اس سے بھی زیادہ جتنا میں سمجھتی تھی کہ وہ جانتی ہوگی۔

وسنتی پھر کہنے لگی" بھابی تم کسی کو اپنے سے اونچا سمجھ سکی ہو یہ بھی بہت ہے۔ اس جیون میں ہر کسی کو تو یہ خوشی نہیں مل سکتی۔ بھابی۔ اور پھر تم اور ہماری بھیا ما تو ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہو۔ میں نے جب جب تمہیں دیکھا ہے تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میرا جی ناچ اٹھا ہے۔ جیسے تم رادھا ہو اور وہ بھگوان کرشن ہو۔ سپنے میں دیکھی سندر مورتیوں کی طرح۔ بھابی ایسی راتیں ہر کسی کے نصیب میں تو نہیں ہوتیں۔ میں مر بھی جاؤں تو وہ پہلی رات نہیں بھول سکتی جب تم مندر میں دیوی ماں کے سامنے ہماری بھیا سے ملی تھیں۔

میں نے کہا۔ اس رات تو میں سوچتی تھی مندر میں موت ہے اور میں ہوں۔ تم کہاں تھیں۔

وسنتی نے ہنس کر کہا مندر کا دوار کھلا تھا اور ہر کسی کو تمہاری طرح پوجا کا ادھیکار ہے۔ ہے نا بھابی۔

میرے من میں ایک شک نے زخمی سانپ کی طرح سر اٹھایا۔ کہیں وسنتی بھی ہماری کے لئے تو وہاں نہ جاتی تھی۔ کیا وہ بھی ہماری کو پوجتی ہے۔

تم کو معلوم ہے وسنتی میں تو بھگوان سے اپنی پوترتا کے لئے موت کا سہارا مانگنے گئی تھی تمہیں تو سب معلوم ہے وسنتی نے پھر کہا۔ دیکھو بھابی تم یوں کیوں گھبرا رہی ہو کیا پریم اور موت میں کوئی فرق ہے؟ اور پھر تمہیں تو اس رات نئی زندگی ملی تھی۔ دیوی ماں نے تم کو جو کچھ دیا وہ کبھی کسی کو کب ملتا ہے۔ اس رات سولہ سنگار کے باریک ساڑھی میں تمہارا روپ اتنا نکھرا تھا کہ اس سے پہلے میں نے کسی روپ وتی کو ایسا نہیں دیکھا۔ تمہارے ہاتھوں میں لگا رنگ، تمہاری آنکھوں میں کاجل کی دھار اور پھر وہ خوشبو جیسے دھرتی کی ساری پوترتا نے عورت کا روپ دھار لیا ہو۔ تمہارے گھنیرے کھلے بال اور تمہارے سفید پاؤں۔ بھابی اس رات تم سر سے پاؤں تک وہ روپ تھیں جو بھگوان کو بھی بس میں کرلے ہماری بھیا تو پھر ہماری تھے۔

وسنتی میں نے بڑے دکھ سے کہا اپنا آپ بلیدان کرنا بہت مشکل ہے۔

اور وسنتی نے بڑے دکھ سے کہا۔ بلیدان کرنا تو بہت لوگ جانتے ہیں پر سویکار کسی کسی کا ہی ہو پاتا ہے۔ تمہیں تو دیوتا ملا ہے کس شے کی چنتا ہے؟

میں نے کہا چنتا یوں پوچھو چنتا کا ہے کی نہیں۔ تم دیکھتی نہیں ہو ہماری گھر میں آتے ہیں تو میری طرف دیکھتے ہی نہیں، تارا سے بات کر کے چلے جاتے ہیں اور پھر دو ایک دنوں میں سب لوگ چلے جائیں گے تم بھی اور وہ بھی۔ اور پھر پیچھے دم گھوٹنے والا چپ چاپ کا سناٹا ہوگا۔ اور اس سنتی رات کے بعد جب لمبی دوپہر آئیں

گی تو یہ سوچ کہ میں بہاری سے بات تک نہ کی کتنا دکھ دے گی۔ جانے پھر کب ملنا ہو اور مل سکیں بھی کہ نہیں؟
وسنتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا یوں نراش کیوں ہوتی ہو بھابی دو ایک دن تو تارا یہاں ہے ہیں کچھ سوچوں گی۔ وہ بہاری کی اور میری آخری ملاقات تھی۔ بھگوان جانتا ہے اس کے بعد وہ صورت میری آنکھوں سے یوں چھپ گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سوچتی ہوں تو لگتا ہے ایک سپنا تھا میں نے سوتے میں ساری زندگی کی خوشیاں اور اپنے بھاگ کے سکھ بھوگ لئے کہ جب آنکھ کھلی ہے تو آج تک اندھیرا ہے۔ میں اس اندھیرے میں اکیلی ہوں اور وہ جو کہتا تھا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو مگر رات میں میری ہو۔ اب کہیں نہیں ہے۔ میں اس سہاگ کی سیج پر اکیلی ہوں اور ہر آہٹ پر چونک کر دیکھتی ہوں کہ شاید وہ اب میرے قریب آئے مگر نہیں وہ چاپ قریب نہیں آتی۔ کوئی نہیں ہے یہ میں ہوں اور یہ اندھیرا ہے آگے اور پیچھے سرسراتا ہوا اور ہر گھڑی ڈستا ہوا اندھیرا۔

اس رات باغ میں نئی گھاس کی میٹھی باس اور پھولوں کی پاگل کر دینے والی تیز سوگندھ تھی۔ میں وسنتی کے بتائے ہوئے راہ پر ننگے پاؤں جا رہی تھی۔ اور آنے والی گھڑی کی بیہوشی مجھ پر ابھی سے چھا رہی تھی آکاش میں چاند ہلکے سفید بادلوں کے پروں پر سے ابھرتا ڈوبتا جا رہا تھا۔ آموں کے جھنڈ میں سے خوشبو نکل کر میرا سواگت کر رہی تھی اور سایوں کا اندھیرا مجھے اندھیرے کے پتی کا پھیلا ہوا رنگ لگتا تھا ہوا ہولے ہولے سرسرا رہی تھی اور پتوں پر رینگتی لگتی تھی۔ چاندنی بڑی پھیکی تھی۔ اور گھڑی گھڑی اوٹ میں ہو جاتی تھی۔ جیسے مجھے چھپ کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پتلا سا چاند کبھی درختوں کی ٹہنیوں میں اٹک جاتا اور کبھی ذرا سے پتے پیچھے گم ہو جاتا۔ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اندھیرا اور چاندنی۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں بہاری کو اس کے بعد کبھی نہیں دیکھوں گی تو شاید میں اس سے وہ سب کچھ کہتی جو میں اب ہر گھڑی جی میں دہراتی ہوں۔ تالاب کے کنارے گرے ہوئے تنے پر ہم دونوں بیٹھے تھے اور دنیا ہمارے لئے کوئی پرانی کہانی تھی۔ وہ مجھ سے ان سب دنوں کی بیتابی کی باتیں کہہ رہا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد ہم ایک دوسرے میں دو جھرنوں کی طرح مل جانا چاہتے تھے ہمارے سانس بے ترتیب اور ہمارے ہاتھ سن ہو جاتے تھے۔ میرے گھنیرے سیاہ بال ہم دونوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور پھر ہم دونوں چپ تھے۔ میں مندر میں گزاری اس پہلی رات کی طرح آخری رات بھی پگھل کر اس کے خون میں مل جانا چاہتی تھی۔ میرا اپنا وجود کہیں نہیں تھا۔ ہر طرف بانکے بہاری تھا۔ میرا دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا تھا اور میں اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی اس کے قدموں میں مرنا چاہتی تھی یہ بھرپور چاہت یہ خوشی جیسے اس کے بعد کچھ تمنا کرنے کو باقی نہ رہا ہو کچھ کہنے کو چنتا کرنے کو باقی نہ رہا ہو اگر اس گھڑی میرا دل ٹھہر جاتا رک جاتا اور ہم دو پھول کی طرح تالاب کے کنارے گر جاتے تو بھی مجھے کوئی غم نہ تھا۔ مگر موت پریم سے شکست کھا جاتی ہے۔ جہاں پریم ہو وہاں موت کہاں گھس سکتی ہے۔ اور اس رات کے بعد آج تک تمنا کرنے اور کہنے کو کچھ باقی نہ رہا۔

جب تالاب کے دوسری طرف بہاری کے قدموں کی چاپ سُنی جیسے سوکھے پتوں پر کوئی چل رہا ہو تو میں نے کہا بہاری تم اتنے دنوں بعد مجھے ملے ہو اگر ان چاپوں کو سننے کے لئے سمے کھوتے رہے تو شاید ہمارے من کو کبھی شانتی نہ ہوگی۔

بہاری نے کہا تھا۔ چمپا اتنی خوشی میں بھی کیوں بھولتی ہو کہ دنیا کا وار سخت ہوتا ہے۔ میں نے کہا میں تمہارے جیسے دیوتا کے سائے میں ہوں تمہارے بازو قلعے سے زیادہ مضبوط ہیں مجھے کسی شے کا ڈر نہیں کسی بات کی چنتا نہیں۔

اور پھر وہ امرت زہر بن گیا۔ وہ گھڑی گزر گئی اور اس کا سایہ اندھیکار بنکر آج تک میرے بھاگ کے لکھے کو چھپائے ہوئے ہے۔

ماں جب جانے لگی ہے تو اس نے مجھے کہا چمپا تجھے اپنے سہاگ اور گھر کی نہیں تو اس کی تو چنتا ہونی چاہئے جس کے لئے تو نے لاج شرم سب چھوڑ دی ہے۔ چمپا میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ دُنیا سے ڈرتے رہنا اچھا ہوتا ہے آگے اور اندھیرے میں بڑھنے والے جب ایک بار ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو سنبھل نہیں سکتے۔

میں نے ذرا غصّے سے کہا " تم کیا کہتی ہو ماں میں نے ایسا کیا پاپ کیا ہے؟"

ماں اپنے ہاتھ ملنے لگی اور بولی "چمپا اب تیری بربادی اور اجڑنے میں کوئی وقت باقی نہیں اری پاپن تجھے اس گھر کبھی دیا نہیں آتی۔ میری کوکھ کو آگ لگ جاتی اور میں تجھے پیدا ہی نہ کرتی تو اچھا تھا۔ تجھے خیال تھا کہ باغ میں اس درخت کے تنے پر بیٹھے تجھے کسی نے نہیں دیکھا۔"

" پر ماں۔" اور ماں نے کہا بس میں اور زیادہ کیا سنوں گی۔ بھیا نے تجھے دیکھا ہے۔ ارے اس کا کیا حال ہوا اس کی خبر ہے۔

تب مجھے لگا میں نے بھیّا کو دو تین دن سے کہیں نہیں دیکھا۔ وسنتی بھی چلی گئی تھی۔ بہاری اس سے اگلے دن ہی تارا اور بُوا کے ساتھ جا چکا تھا۔ پھر ماں بھی چلی گئی اور میں ڈرتی کانپتی بھول میں رہنے والی راجکماری کی طرح کسی روشنی کی راہ دیکھتی رہی کسی آس کا سہارا لینے کے لئے۔ جانے اب بہاری سے کب ملنا ہو۔ میرے دامن میں بندھے موتی کھل کر سب بکھر چکے تھے۔

شیگھر اس دن دیوانوں کی طرح دالانوں میں گھومتا پھرتا تھا اور اپنے بال نوچتا تھا جس دن بُوا کے ہاں سے سویرے سویرے آدمی آیا ہے۔ میں گُم سُم بیٹھی تھی اور مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں دالان میں تیز دھوپ میں سے اٹھا کر جب باندیوں نے مجھے اندر کمرے میں لٹایا ہے اور ٹھنڈے پانی سے بھگو کر پنکھا جھلا ہے تو میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتی تھی سب چہرے سُتے ہوئے اور اُداس تھے اور مجھے بھول چکا تھا

کہ شیکھر سویرے سے جا چکا ہے۔ اور بہارؔی کی گردن کسی نے تیز چھری سے کاٹ دی ہے وہ گردن جس پر سے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی وہ شان سے اونچی اٹھی ہوتی اور سر جو غرور سے نہیں یونہی دیوتاؤں کی طرح سیاہ بالوں کے تاج سے اتنا سندر لگتا تھا۔ اس سر کو انھوں نے الگ کر دیا تھا جو سر میرے کندھوں پر ٹکا رہتا تھا میں دائیں بائیں دیکھتی اور کہتی "بہاری نہیں ہے" اور دیکھنے والی باندیاں افسوس سے کہتیں بہو کا دماغ چل گیا ہے۔

وسنتی جب شام کو آتی ہے تو اس کا رنگ یوں زرد تھا جیسے اس کے کندھوں پر کسی مری ہوئی عورت کا چہرہ لٹکا دیا گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ "بھابی پگلی بن کر کیا تم افسوس زیادہ کر سکتی ہو۔ تمہاری انہی باتوں نے تو بہاری بھیا کی جان لی ہے اور اب دنیا کو تماشا دکھا رہی ہو۔ تمہارا پریم گہرا نہیں۔ ہے تم صرف پریم کا سکھ جانتی ہو۔ اس کی پیڑا سے واقف نہیں ہو۔ تم نے جس شے کو چاہا ہے بل سے ضد سے پا لیا ہے اس لئے تم نراش ہونا نہیں جانتیں۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی یہ وہی وسنتی تھی جو میرے سامنے کچی سے بڑی ہوئی تھی جو مجھے پدمنی کی طرح پیاری تھی اور جو مجھے پریم کرنے اور آس نراس کا سبق دے رہی تھی۔

میں نے کہا وسنتی تم غلط سوچتی ہو میں نے اتنے دنوں نراش اور دکھ کے ساتھ گزارے ہیں تم نہیں جانتیں۔

وسنتی نے اسی طرح کہا جب آگے بھی کوئی آس نہ ہو تو تم نراش ہونا جانو تو میں سمجھوں۔

دنوں کوئی خبر نہ آئی جس کو بھجوایا جاتا وہیں کا ہو رہتا۔ پھر شیکھر نے پیغام بھیجا کہ بہاری کی حالت سدھر رہی ہے اور تھوڑی آس ہے شاید وہ تندرست ہو جائے اور چند مہینوں میں ٹھیک ہو جائے۔ وسنتی بھی اپنی سسرال جا چکی تھی۔ گھر کے کاموں سے نمٹ کر میں ایسی راتوں میں جب تیسری چوتھی رات کا چاند باغ سے کھسکتا اور پتوں کی اوٹ میں چھپتا تالاب پر آتا تو اس گرے ہوئے درخت کے تنے پر جا بیٹھتی اور بس پانی میں جھانکتی رہتی اُن گہرے سایوں کو دیکھتی اور بیٹھی رہتی یہاں تک کہ نرم ہوا چلنے لگتی اور چڑیاں ڈال ڈال پات پات چوں چوں کرتیں اور سویرے کی سُرخی پورب میں سے اُبھرتی۔

شیکھر واپس آگیا۔ بہاری کی حالت سنبھل گئی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ کہتا پتہ نہیں اتنے سندر اور ہنس مکھ بہاری کا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے زور کے بل پر بھی کسی کو نہیں دھتکارا۔ اور میں بھیا کا سوچتی جس کو میں نے مہینوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کی باتیں میرے کانوں میں اُسی طرح سُنائی دیتیں اور پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی رہتی۔

پھر سُنا بہاری کے ٹھیک ہونے کی خوشی میں بُوا نے اپنے گاؤں میں بہت بڑی پوجا کروائی ہے۔ ماں کے ہاتھ بھیا کا پیغام ملا کہ تمہارے وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اگر تم گئیں تو میں تمہیں بھی کاٹ کر رکھ دوں گا۔

عین اس دن جب ہم سب تیار تھے اور دروازے سے نکلنے والے تھے مجھے اپنا دل یوں بیٹھتا لگا جیسے بس ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکل ہی تو جائے گا۔

میری وجہ سے وسنتی بھی رک گئی شیکھر پدمنی کو لے کر چلا گیا۔

پھر ساری باتیں یوں تیز تیز ہوئیں جیسے آندھی چلنے لگے اور میں اُس تیز ہوا کے ساتھ اڑ کر آنکھ کھلی ہے تو یہاں پر تھی۔

وہ گھر مجھ سے چھٹ گیا جو میری آشا اور نراشا کا ساتھی تھا اور پدمنی جس کو میں نے کبھی گھوم کر نہ دیکھا تھا جو سدا میرے پیار کی بھوکی رہی تھی۔

وسنتی کہتی تھی "بھابی تم بھیا کی بات کو کیوں اتنا بڑا سمجھتی ہو۔ انھیں گھر آنے دو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔ آپ سے آپ ہر بات درست ہو جائے گی تم بس تھوڑے دنوں اور رہ سکو تو کیا تمہیں مجھ پر وشواس نہیں ہے۔ مجھے اس پر وشواس تھا مجھے شیکھر پر بھی وشواش تھا پر مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔

جانے میرے اور بہاری کے راز کو کتنے لوگ جانتے تھے؟

شیکھر میرا پوجاری! اور اُس نے اپنی مورتی کو اپنے ہاتھوں ہی توڑ دیا۔

اس کی طرح پدمنی کو بھی مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ میری صورت کو دیکھ لیتی تو پہروں دیکھتی رہتی۔ جب شیکھر کے گھر میں سوتیلی ماں کے ہاتھوں دُکھ اُٹھا اُٹھا کر وہ مری ہے تو مجھے اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔

شمشان میں بیٹھی میں پاگلوں کی طرح اس راکھ میں پدمنی کی وہ آنکھیں ڈھونڈتی رہی جن کی روشنی اس راکھ میں مل گئی۔ اپنے پاؤں چومنے والے شیکھر اپنے مرن جیون کے ساتھی اپنے پتی کو بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب چتا کو آگ دکھائی گئی ہے تو جو سفید بالوں اور سفید ڈاڑھی والا بوڑھا رو رہا تھا وہ کوئی اور ہو گا۔ جانے کون ہو گا۔ پدمنی کے لئے جب میری آنکھ سے آنسو نہ نکلا تو اس پر رونے والا بھلا اور کون ہوتا۔

اور بھیا نے آج تک مجھ سے بات نہ کی۔

پھر سُنا ایک سال بعد جب اس کے زخم چھٹ گئے تھے اور وہ تارا پر جان دینے لگا تھا اپنے پچھلے پاپوں کا پرائشچت کرنے والا تھا بہاری اچانک مر گیا۔ یوں جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے کوئی نازک پھول شاخ سے نیچے آ رہے۔

میں اُس دن بھی نہیں روئی اور افسوس نہیں کیا۔ بھلا کوئی سپنے میں دیکھی صورتوں کے لئے روتا ہے۔

پر اس گھڑی سے مجھے اور بہت سی چیزوں کی طرح بھگوان کی دیا پر بھی وشواس نہیں ہے وہ ایک گھڑی دیتا ہے تو دوسرے لمحے چھین بھی لیتا ہے۔ پھر ایسے بھگوان سے کوئی کیا مانگے۔

اور یوں اوم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔
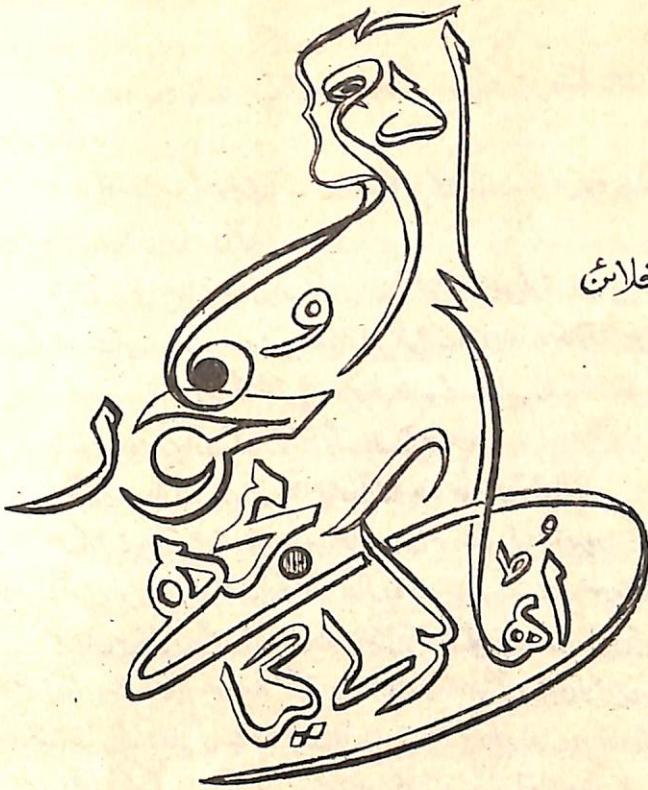
ترجمہ:۔ شبیر احمد

ہمیں اس کا شبہ بھی نہیں تھا کہ اس علاقے میں شیر ہو سکتے ہیں۔ اچانک ایک رات چیخنے کی آوازوں نے ہمیں دہلا دیا۔ شیر ہمارے ایک مزدور کو اٹھا لے گیا تھا۔

ہم نے شیر کا پیچھا کیا لیکن رات کی تاریکی آڑے آئی اور راستہ ڈھونڈنا ناممکن ہو گیا۔ صرف چیخوں کی آواز ہی پر ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ آہستہ آہستہ یہ خوفناک چیخیں مدھم ہونا شروع ہو گئیں اور پھر ایک غرغراہٹ کی آواز پر ختم ہو گئیں۔ اب تلاش بے سود اور خطرناک تھی۔

شیر نے اپنا پہلا شکار کر لیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ مزدور اس..... کیمپ سے غائب ہو گئے۔ ہم نے اب تک اس شیر کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ رات کی تاریکی میں اس قدر آہستگی سے آتا تھا کہ ہر ممکن احتیاط کے باوجود ایک نہ ایک مزدور کو دبوچ کر لے جاتا۔ ایک دن میں نے اسے دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا شیر

تھا۔ لیکن بوڑھا ہو چکا تھا اور اس میں اب اتنی سکت، تیزی اور طاقت نہیں تھی کہ جنگلی جانوروں کا شکار کر سکے۔ اس لئے یہ آدم خور بن گیا تھا۔ اُس پاس کوئی دوسری بستی نہیں تھی، جہاں سے یہ اپنا شکار حاصل کر سکے۔ اس لیئے اس کی ساری توجہ ہمارے ہی کیمپ پر تھی۔ ہم نے انتہائی کوشش کی کہ اسے مار دیں، لیکن وہ اتنا چالاک ہو گیا تھا کہ موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ دوسرے جنگل بہت گھنا تھا اور اسے یہ قدرتی پناہ گاہ مل جاتی تھی جہاں سے اسے ڈھونڈ نکالنا تقریباً ناممکن تھا۔

اس نے ہمارے تین مزدور غائب کر دیئے اور دو کا اور شکار کر چکا ہوتا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اُنھیں اُٹھائے جائے ہم نے شور غل مچا کر اُسے ڈرا دیا، وہ اُنھیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہ دونوں مزدور اس بُری طرح زخمی ہو چکے تھے کہ چند روز بعد مر گئے۔ ہمارے کیمپ میں اب سراسیمگی پھیل چکی تھی اور یہ اندیشہ تھا کہ اگر یہ شیر مارا نہ گیا تو کسی دن بھی مزدور کام چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

اُس زمانے میں مَیں افریقہ کی ٹیلیگراف کمپنی میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ کام کر رہا تھا۔ اُس وقت یہ کمپنی وسطی افریقہ میں ٹیلیگراف لائن بچھا رہی تھی۔ ہمارے کیمپ میں پچاس مقامی باشندے بحیثیت مزدور کام کر رہے تھے۔ ڈین ان کا فورمین تھا۔ ہمارا کیمپ جھیل نیاسا کے پاس ایک کھلی جگہ پر تھا۔ ہمارے جھونپڑے قریب قریب تھے۔ اسی لائن میں تیسرا جھونپڑا ہمارا اسٹور روم تھا۔ مزدوروں نے اپنے رہنے کے لئے جھاڑیوں اور پتوں سے معمولی سے شیڈ بنا لیئے تھے، جس کے چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ تھی۔ ہمارے جھونپڑے بھی بالکل کچّی قسم کے تھے۔ زمین میں تین تین فٹ دوری پر بانس گاڑ کر چاروں طرف چٹائی کی دیوار بنا دی گئی تھی۔ دروازے بھی یوں ہی چٹائی کے، کام چلانے والے لگا دیئے گئے تھے۔ میرا پلنگ بھی بالکل عارضی تھا۔ پانچ فٹ لمبے بانس کے چار ٹکڑے گاڑ کر اس کے چاروں طرف فریم سا بنا دیا گیا تھا اور اس پر ایک چٹائی سی بُن دی گئی تھی۔ اس پر میرا بستر بچھا رہتا تھا۔ یہ پلنگ دیوار کے قریب اور دروازے کے عین سامنے تھا۔ کمرے کا بقیہ فرنیچر ایک فولڈنگ کرسی اور ایک دو خالی بکسوں پر مشتمل تھا۔

اس رات ہم اپنے اپنے جھونپڑوں میں سونے چلے گئے۔ اپنی رائفلیں ہم سونے سے پہلے ہی بھر کر پلنگ کے پاس رکھ لیتے تھے تاکہ بوقت ضرورت فوراً استعمال کر سکیں۔ کپڑے بدل کر میں نے بندوق کا پھر ایک بار معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر اسے احتیاطاً اسے قریب پڑے ہوئے صندوق سے لگا دیا۔ دروازہ بند کر کے لیمپ گل کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

کچھ دیر تک میں اپنی مچھر دانی کے اندر چپ چاپ پڑا مختلف جنگلی جانوروں کی آوازیں سنتا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے نیند آ گئی۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، یہ رات کے دو بجے کا واقعہ تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میرا پلنگ ہل رہا تھا، گویا زلزلہ سا آ گیا ہے۔ مجھے غنودگی کے عالم میں یوں محسوس ہوا کہ میں بخار کی وجہ سے کانپ رہا ہوں۔ اس کے

بعد شیر کی مخصوص بُو میرے نتھنوں میں آئی ۔ ایک تیز بُو جو صاف پہچانی جاتی تھی کہ یہ شیر کی ہے ۔ نیند کافور ہوگئی ۔ میرے جسم کے ہر حصّے سے پسینہ چھوٹ پڑا، سر سے لے کر پاؤں تک ایک سنسناہٹ سی سارے جسم میں دوڑ گئی ۔ خوف اور دہشت سے بُرا حال ہوگیا ۔ آدم خور میرے جھونپڑے ہی میں نہیں، بلکہ میرے پلنگ کے نیچے تھا ۔

چیخنے کے لئے میں نے مُنہ کھولا لیکن منہ سے کوئی آواز نہ نکلی ۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بقا اسی میں ہے کہ بالکل ساکت پڑا رہوں ۔ ذرا سی آواز یا حرکت میری موت کا سبب بن سکتی ہے ۔ میں نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لئے جو ڈر اور خوف کی شدت سے بج رہے تھے اور اس طرح انتہائی کوشش سے میں اپنے جسم کو قابو میں رکھے رہا ۔

میرا پلنگ ہلنا بند ہوگیا ۔ شیر پلنگ کے نیچے سے نکل آیا تھا ۔ اُسے میری بو مِل چکی تھی اور وہ اب سونگھتا ہوا میرے پلنگ کے چاروں طرف چکّر لگا رہا تھا ۔ غالبًا مچھر دانی کی وجہ سے چکرا رہا تھا، جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ۔

ایک لمحہ کے لئے میں نے ارادہ کیا کہ ایک دم تیزی سے چھلانگ لگا کر نکل بھاگوں اور رائفل اٹھا کر فائر کر دوں ۔ لیکن رائفل کچھ ایسے زاویے پر رکھی ہوئی تھی کہ اس سے پہلے کہ میں رائفل اٹھا پاتا، شیر مجھے دبوچ لیتا ۔

میں نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ اپنے بستر میں دبکا رہوں ۔ میں بستر میں اور گھس گیا اور سر کو تکیے سے ڈھانپ لیا ۔ اس حرکت سے یہ فائدہ ہوا کہ میرا چہرہ زخمی ہونے سے بچ گیا ۔ لیکن اور کچھ فائدہ نہ ہوا ۔

دوسرے لمحے شیر کے دانت مجھے اپنے کندھے پر گڑتے ہوئے محسوس ہوئے اور مجھے بستر میں لپٹا ہوا فرش پر کھینچ لیا گیا ۔ مجھے کوئی درد محسوس نہیں ہوا، لیکن یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میرے کندھے اور گردن سے خون کی دھار بہہ نکلی ہے ۔ موت میری طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے، میں مجبور اور بے بس اس خونی درندے کے قابو میں تھا ۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن شیر کے ایک ہلکے سے تھپڑ نے میری بائیں ران ادھیڑ دی ۔ میں پھر گر گیا ۔ شیر نے اپنا ایک پنجہ میرے سینے پر رکھا ۔ میں سچ کہتا ہوں اس وزن سے پسلیاں ٹوٹتی محسوس ہوئیں پھر وہ ایک زور دار آواز سے گرجا، گویا فاتحانہ نعرہ لگا رہا ہے ۔ تمام کیمپ میں کھلبلی مچ گئی ۔ چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں اور مرد و زن نے اپنے تحفظ کے لئے بھاگنا شروع کر دیا ۔ میرا ذہن اس وقت تک کسی قدر ماؤف سا ہو چکا تھا مجھے ڈین کی ہلکی سی آواز آئی جو مجھے پکار رہا تھا " پیٹر پیٹر! تم کہاں ہو؟"

وہ میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا چیخ رہا تھا، لیکن دہشت نے میری زبان گنگ کر رکھی تھی ۔ میں اُسے کوئی جواب نہ دے سکا ۔ ڈین کی چیخ پکار سے شیر کچھ چوکنا ہوگیا اور اس نے اپنے دانت میری داہنی ران میں گاڑ کر مجھے اٹھا لیا اور جھونپڑے سے باہر چل پڑا ۔ میرا وزن اس کے لئے ایک چوہے کے وزن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا ۔ وہ بغیر کسی تکان کے اس اندھیری

رات میں مجھے باہر لے کر نکل گیا۔ مجھے یہ بعد میں معلوم ہوا کہ جب شیر مجھے جھونپڑے سے باہر لے جانے لگا تو وہ ڈین کے اتنے قریب سے گزرا کہ ڈین مجھے ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔ ڈین میری حالت دیکھ کر گھبراہٹ سے لڑکھڑا گیا، لیکن اس نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا کمرے میں آکر لیمپ روشن کیا۔

اس کے بعد اس نے مزدوروں کو للکارا کہ فوراً مشعلیں بنا کر اس کے ساتھ شیر کی تلاش میں چلیں۔ لیکن مزدوروں پر خوف اتنا غالب تھا کہ انھوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے دو مزدور ساتھ دینے کے لئے تیار ہوئے۔ وہ درختوں سے اتر کر فوراً لکڑیوں سے مشعل بنانے لگے۔ یہاں کے جنگلوں میں جو لکڑیاں ہوتی ہیں ان میں خاص قسم کا ایک گوند ہوتا ہے جو تیل کی طرح جلتا ہے۔ سوکھی لکڑیاں کا گٹھا کافی اچھی مشعل کا کام دیتا ہے۔

مجھے علم نہیں کہ اس وقت کیمپ میں کیا ہو رہا ہے۔ شیر مجھے بڑے اطمینان سے لٹکائے ہوئے جنگل کے اندر لئے جا رہا تھا۔ میرے ہوش و حواس کیسے قائم رہے، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ شاید میں اپنے زخموں کی اہمیت ہی نہیں سمجھ سکا۔ میرے سمجھنے اور تکلیف کے احساس دلانے والے اعصاب کچھ ایسے ناکارہ ہو گئے تھے کہ مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ غالباً میرا دماغ خطرات کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہو گیا تھا۔

ایک بڑے درخت کے نیچے شیر نے مجھے زمین پر ڈال دیا۔ میں پیٹھ کے بل زمین پر پڑا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور میں شیر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اب مجھے یہ ضرور محسوس ہوا کہ میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ پھر بھی میں ذرّہ برابر خائف نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا میں کوئی کھیل دیکھ رہا ہوں۔ لمحے گزر رہے تھے۔ شیر اپنی بے رحم سبزی مائل زرد آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اب میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ شیر کس طرح اپنا شکار کھانے سے پہلے اپنے شکار کی گردن دونوں پنجوں سے دبا کر توڑ ڈالتا ہے۔ لیکن ایسی کوئی کوشش میرے لئے ضروری نہیں تھی کیونکہ میں ادھ مُوا تو ہو چکا تھا اور اس کا ایک ہلکا سا تھپڑ مجھے ختم کرنے کے لئے کافی تھا۔

آہستہ آہستہ شیر کا سر میرے چہرے کے قریب آتا گیا۔ اس کی سانس کی بدبو سے میرا دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ یکایک میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ شیر غصہ سے غرّایا اور میرے داہنے ہاتھ کی تین انگلیاں چبا ڈالیں۔

میرے اعصاب اس قدر بے جان ہو گئے تھے کہ مجھے اس پر بھی کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ اب شیر کے دانت مجھے اپنے گوشت میں گڑتے محسوس ہوئے۔

مجھے بعد میں بتایا گیا کہ ڈین اپنے دونوں مشعل برداروں کے ساتھ جلد از جلد میری تلاش میں نکل پڑا۔ لیکن رات کی تاریکی اور جنگل کے گھنے پن نے اسے چکرا کر رکھ دیا کہ آخر کس سمت میری تلاش کی جائے۔ وہ تقریباً نا امید سا ہو گیا تھا کہ شیر کے غرانے کی آواز آئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپایا تھا اور شیر نے میری انگلیاں چبا ڈالی تھیں۔

ڈین اس آواز کی سمت تلاش کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہاتھ میں رائفل تیار تھی۔ اس کے ساتھ ہی دائیں بائیں مشعل بردار ڈرے سہمے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ خدا جانے شیر کس سمت سے ان پر حملہ کر دے۔ اچانک مشعل کی زرد روشنی میں انہیں شیر کی جھلک نظر آئی جو مجھ پر جھکا ہوا تھا۔

دونوں مزدوروں کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگیں اور وہ تقریباً بھاگ پڑے۔ ڈین نے انہیں ڈانٹا اور کہا کہ اگر وہ اس طرح اسے چھوڑ کر بھاگیں گے تو شیر انہیں یقیناً پھاڑ کھائیں گے۔ ان کی بچت اسی میں ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ پس و پیش کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ڈین کے قریب آگئے۔

"بالکل میرے ساتھ دائیں بائیں ہو کر چلو" ڈین نے حکم سنایا۔

اب وہ تینوں شیر کی طرف محتاط قدموں سے بڑھنے لگے۔ شیر نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور کرخت آواز میں غرّایا، وہ تینوں آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے اور شیر کے درمیان صرف دس قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ ڈین فوراً ایک گھٹنے پر جھک گیا۔ شست باندھی اور فائر کر دیا۔ میں نے آدم خور کے گولی لگنے کے دھکّے کو بھی محسوس کیا۔ زخم کاری نہیں تھا۔ اس گولی کا اثر صرف یہ ہوا کہ شیر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

انتہائی پھرتی سے ڈین نے رائفل کا لیور کھینچا، تاکہ دوسرا کارتوس چیمبر میں جا سکے، لیکن کچھ تو جلد بازی اور کچھ بندوق کے پرانے ہونے کی وجہ سے اس کا لیور پھنس گیا۔ اب نہ وہ آگے جاتا ہے نہ پیچھے۔ ڈین نے پھر زور لگایا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ لیور پھر بھی نہ نکلا۔ بغیر مزید تامل کے ڈین نے بندوق کی نالی ہاتھ میں پکڑ لی۔ شیر نے حملہ کرنے کے لئے پنجہ اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ شیر اپنا پنجہ ڈین کے مارے، ڈین نے تیزی سے بندوق گھما کر شیر کے سر پر لاٹھی کی طرح دے ماری۔ بندوق کا دستہ ٹوٹ کر اندھیرے میں کسی سمت اڑ گیا۔ شیر ایک خوفناک گرج کے ساتھ دھاڑا۔ بھلا اس ہلکی سی بندوق کی ضرب کا شیر پر کیا اثر ہوتا۔ اب بندوق بالکل بیکار ہو چکی تھی۔ ڈین نے اسے پھینک کر فوراً ایک مزدور کے ہاتھ سے مشعل چھین لی اور اسے شیر کے منہ میں گھسیڑ دی۔ شیر اس اچانک مصیبت کے لئے تیار نہ تھا وہ گھبرا کر کسی قدر پیچھے ہٹا۔

"دوڑو —" ڈین نے چیخ کر مزدور سے کہا: جلدی میری دوسری بندوق کیمپ سے لے آؤ۔

دونوں مزدور جو ابھی تک مسحور اور مبہوت کھڑے تھے، ہوش میں آ گئے۔ اور ان میں سے ایک کیمپ کی طرف دوڑ پڑا۔ ڈین اسی طرح مشعل سے بڑھ بڑھ کر شیر پر حملے کرتا رہا گویا اس کے ہاتھ میں مشعل نہیں ایک تلوار تھی۔ وہ اسے تیزی سے گھمانے لگا۔ مشعل ہوا لگنے سے اور بھڑک اٹھی۔ اس کا شیر پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ڈین پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ڈین دیوانوں کی طرح شیر پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ وہ اسے اتنی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر سکے اور وہ اتنی دیر مشغول رکھنا چاہتا تھا کہ مزدور دوسری رائفل لے آئے۔ وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ لیکن شیر بھی پیچھے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ برابر غرّا رہا تھا اور ڈین کو بار بار پنجہ مارنے کی کوشش کرتا تھا۔ دونوں میں برابر کی جنگ تھی۔ شیر بالکل میرے سر پر کھڑا غرّا رہا تھا۔ اس کی آواز سے میرے سر میں درد ہونے لگا۔

ڈین کی ہمت اور پھرتی میں ذرّہ برابر فرق نہ آیا۔ وہ اسی بے جگری سے اپنی جان کی پروا کئے بغیر شیر سے لڑتا رہا۔ اتنی ہمت اور دلیری کسی دوسرے شخص میں میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اگر کہیں وہ مزدور خوف کی وجہ سے رائفل لے کر نہ لوٹا تو پھر کیا ہوگا۔

تیز تیز قدموں کی آواز رات کے سنّاٹے میں آئی اور معلوم ہوا کہ مزدور بندوق لے کر آ رہا ہے۔ ڈین نے دوسرے مزدور کو بھی ڈانٹ کر حکم دیا کہ شیر کے سامنے وہ اپنی مشعل نچانا شروع کر دے۔

جونہی مزدور قریب آیا، ڈین نے مشعل فوراً پھینک دی اور بندوق سنبھال لی۔ اور اس کی نالی شیر کے سر سے لگا دی۔ ایک زبردست دھماکا ہوا اور گولی شیر کے سر میں پیوست ہو گئی۔ ظالم درندے نے ایک خوفناک چیخ ماری اور میرے قریب ہی گر کر ڈھیر ہو گیا۔

اس کے گرتے ہی تمام مزدور درختوں سے اتر آئے۔ ڈین نے ایک رسّی نکالی اور فوراً ایک اسٹیچر سا بنا کر مجھے اس پر لٹایا۔ مزدور مجھے اٹھا کر کیمپ کی طرف لے چلے۔ اس دوران میں کچھ مزدوروں نے پانی گرم کیا اور فرسٹ ایڈ بکس اور دیگر ضروری سامان تیار کرنے لگے۔

میرے جسم پر بیس زخم ڈین نے گنے۔ اور جب اس نے مجھے ساری تفصیل سنائی تو واقعی میرے سارے جسم میں شدید درد محسوس ہوا۔ اتنا شدید درد کہ میں تڑپنے لگا۔ ڈین نے مجھے برانڈی پلائی۔ میرے زخموں پر جتنی اچھی طرح ہو سکا پٹیاں باندھیں۔ اس نے مجھے بعد میں بتایا کہ زخم اتنے بھیانک تھے کہ وہ ڈریسنگ کرتے وقت دوبارہ بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔

اس کے فوراً بعد مجھے قریبی ہسپتال، جو یہاں سے ۳۵ میل دور تھا، پہنچا دیا گیا۔

کئی ماہ تکلیف سہنے کے بعد، جس میں متعدد آپریشن ہوئے اور کئی بار خون دیا گیا ـــــ میں ڈاکٹروں کی مسلسل جد و جہد سے صحت یاب ہوا۔ تاہم آدم خور مجھے یہ نشانی دے گیا کہ میں اپنے پیروں کے استعمال سے محروم ہو گیا اور اب بیساکھیوں کی مدد سے چلتا ہوں اور دائیں ہاتھ کی تین انگلیاں غائب ہیں

ترجمہ :۔ مقبول جہانگیر
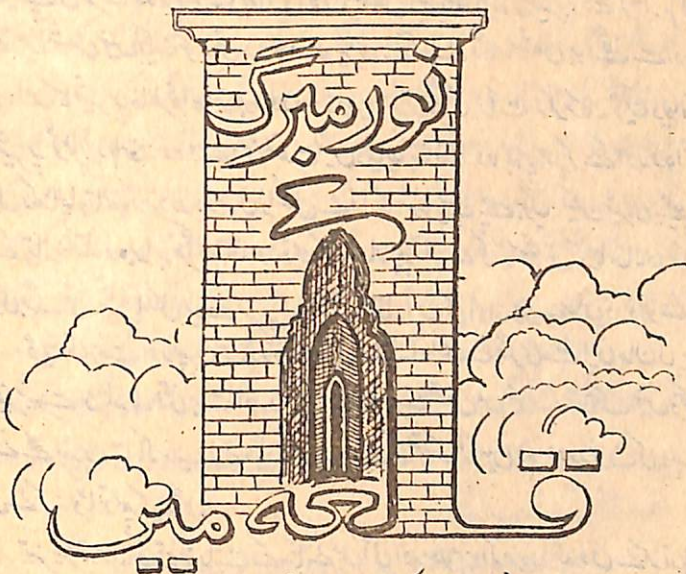
یہ ناقابل فراموش اور عبرتناک حادثہ نورمبرگ کے پرانے قلعے میں پیش آیا تھا۔ میں جس زمانے... کا ذکر کرتا ہوں، اس زمانے میں نورمبرگ کا یہ پرانا قلعہ سیاحوں کے لیے زیادہ کشش نہ رکھتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کے اس دور افتادہ اور بہت پرانے شہر تک پہونچنے کی سہولتیں کچھ زیادہ نہ تھیں اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو دور دراز کا سفر طے کر کے اور سینکڑوں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد نورمبرگ پہونچتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازیوں نے نورمبرگ کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا، اس لئے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جب سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو پتہ چلا کہ نورمبرگ میں بارھویں عیسوی صدی کی عمارتوں کے آثار موجود ہیں تو وہ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔

ان دنوں میری شادی ہوئے دو ہی ہفتے گزرے تھے اور ہم میاں بیوی یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے ایک روز فرینک فرٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے تو ہماری ملاقات ہوچیسن سے ہوئی۔ وہ خوبصورت نوجوان نہایت باتونی اور مسخرے پن کی حد تک ہنس مکھ امریکی سیاح تھا۔ جس نے جلد ہی ہم سے گہری دوستی حاصل کر لی۔ وہ منہ ٹیڑھا کر کے جب تیزی سے انگریزی بولتا تو میری بیوی کے لئے اپنی ہنسی کو ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہوچیسن کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں وہ اپنی

بہادری اور سیاحت کے ایسے ایسے عجیب قصے بیان کرتا کہ حیرت ہوتی۔ اگرچہ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بولنے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، تاہم ایسے ساتھی کی موجودگی ہمارے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی اور وہ تفریح کا بہت عمدہ ذریعہ بن گیا۔

نورمبرگ کا قلعہ دیکھنے کی تجویز بھی اسی نے پیش کی تھی۔ اور میری بیوی امیلیا جسے ایسی عمارت دیکھنے کا ازحد شوق تھا فوراً آمادہ ہو گئی۔ نورمبرگ دریائے پیگنیز کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ایک حصہ پرانا شہر کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ نیا شہر۔ پرانا شہر تمام قرونِ وسطیٰ کے رومن فن تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ یہاں شہر کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے جس میں چار بڑے بڑے دروازے اور ۱۲۸ سیڑھیاں ہیں۔ شہر کا یہ حصہ زیادہ تر پہاڑیوں کے اوپر آباد ہے جو شمال سے مغرب کی جانب پھیلتی چلی گئی ہیں۔ اور اسی مقام پر سرخ پتھروں کا بنا ہوا وہ عظیم الشان قلعہ بنا ہوا ہے جس کے ایک کمرے میں یہ عبرتناک حادثہ پیش آیا تھا جو میں آگے چل کر بیان کرنے والا ہوں۔

نورمبرگ کا قدیم قصبہ اس قلعے سے نیچے آباد ہے۔ چوں کہ یہ قلعہ سب سے اونچی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے اس لئے اس کی فصیل سے شہر کا نظارہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ قلعے کی شمالی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت گہری کھائی ہے جو صدیوں سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاسی ہے۔ رومن بادشاہوں کے عہد حکومت میں یہ کھائی جسے دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے یقیناً پانی سے بھری رہتی ہوگی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنے آدمی گر گر کر ہلاک ہوئے ہوں گے مجھے بتایا گیا کہ اکثر مجرموں کو جب اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تو اس کے بعد لاشوں کو کھائی میں پھینک دیا جاتا، ان دنوں اس کی گہرائیوں میں گوشت خور مچھلیاں بھی بڑی تعداد میں پرورش کی گئی تھیں یہ لاشیں ان مچھلیوں کا من بھاتا کھاجا تھیں۔

اس خشک کھائی نے زمین کا بہت سا حصہ گھیر رکھا تھا، اس لئے نورمبرگ کے گورنر نے اسے استعمال کرنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا۔ اس نے یہاں درختوں اور پودوں کی بہت سی قسمیں لگوا دی تھیں اور کہیں کہیں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ان کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے، فصیل سے اس کی گہرائی اندازاً پچاس ساٹھ فٹ ہوگی۔ اس سے پرے شہر کے مکانات دکھائی دیتے ہیں جن کی سرخ سرخ ڈھلوان چھتیں تیز دھوپ میں خوب چمکتی ہیں۔ دائیں جانب قلعے کی فصیل کے ساتھ ہی وہ چھوٹی چھوٹی برجیاں اور گنبد دور

تک پھیلے ہوئے تھے جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے۔ اور انھیں کے درمیان ایک بڑے سے گنبد کے نیچے قلعے کا سب سے اہم کمرہ بنا ہوا تھا جسے خاص طور سے دیکھنے کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔۔ یہ وہ کمرہ تھا جو سینکڑوں آدمیوں کی جان لے چکا تھا۔ اسی کمرہ میں وہ عجیب وغریب مشینیں رکھی ہوتی تھیں۔ جن کی مدد سے انسان صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم، اذیت اور عذاب کے طریقے آزماتا چلا آیا ہے۔ یہاں بادشاہ مجرموں کو ایسی ہولناک سزائیں دیتے تھے کہ آج بھی انھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے پورے قلعے کی سیر کرلیں اور پھر اس ہیبت ناک کمرے کو سب سے آخر میں دیکھیں تاکہ ہماری طبیعتیں یہ ناخوشگوار اثر کم سے کم قبول کریں۔ اسی دوران میں ہم تینوں ذرا دم لینے کے لئے فصیل کے قریب جا کھڑے ہوئے اور جھک کر کھائی میں لگے ہوئے پھولوں کے تختے اور درختوں کو دیکھنے لگے۔ جولائی کی تیز اور روشن دھوپ میں یہ نظارہ آنکھوں کے لئے بڑا فرحت انگیز اور خوش گوار تھا۔ رنگ برنگ پھولوں کے تختے بڑے بڑے خوشنما قالینوں کی صورت میں ہمارے سامنے بچھے ہوئے تھے۔ اور جب تیز ہوا چلتی تو یہ پھول جھومنے لگتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت کے بنائے ہوئے ان حسین قالینوں میں حرکت پیدا ہوگئی ہے۔ قلعے کی سیر کرتے ہوئے ہم واقعی تھک گئے تھے اور اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ جگہ ہوتی بھی تو اس کھلے آسمان تلے دھوپ میں بیٹھتے بھی کہاں؟ دفعتہً میری بیوی نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا اور ہم نے جھک کر ادھر دیکھا تو ایک تماشا نظر آیا۔

سیاہ رنگ کی ایک بڑی بلی جس کی کھال دھوپ میں خوب چمک رہی تھی، فصیل کے عین نیچے دھوپ میں آرام سے بیٹھی تھی اور اسکا بچہ جسکا رنگ بھی سیاہ تھا، قریب ہی کھیل رہا تھا۔ بلی اپنی لمبی دم ہلاتی اور بچہ اس کی طرف جھپٹتا۔ کبھی وہ دم پر پنجہ مارتا اور کبھی اسے اپنے منہ میں دبا لیتا۔ اور پھر زور لگا کر اپنی ماں کو گھسیٹنا چاہتا۔ بلی اپنے پاؤں کو جنبش دے کر آہستہ سے پرے دھکیل دیتی اور دم زور زور سے ہلانے لگتی اس پر بچہ اور جوش میں آکر اچھلنے کودنے لگتا۔ غالباً اسے اس کھیل میں بڑا مزا آرہا تھا۔

چند منٹ تک ہم تینوں نہایت دلچسپی سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ پھر یکایک امریکی نوجوان

نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور ہنس کر بولا۔
ذرا دیکھنا میں آپ لوگوں کو ایک دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں۔ میں یہ پتھر ان کے قریب پھینکتا ہوں۔ وہ دونوں حیران ہوں گے کہ یہ پتھر کہاں سے آن گرا۔

"ارے یہ کیا غضب کرتے ہو۔" میری بیوی نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ وہ ڈر جائیں گے۔ کیوں ان کا مزا کرکرا کرنے کی فکر میں ہو؟"

"مادام آپ کیوں گھبراتی ہیں ـــ یہ کھیل اور دلچسپ بن جائے گا۔"

"اچھا بھئی تمھاری مرضی۔ مگر خدا کے لئے ذرا احتیاط سے پتھر پھینکنا، کہیں تم اس پیارے سے ننھے بچے کو نہ زخمی کر دو۔"

"اجی آپ خوامخواہ ڈرتی ہیں، کیا میں بچّہ ہوں جو ایسی بد احتیاطی کروں گا۔ امریکی نوجوان نے گردن ہلا کر کہا۔ "مادام میں تو ایسا رحم دل آدمی ہوں کہ میں نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔

اور شیر چیتے ہلاک کرتا رہا ہوں!" میں نے لقمہ دیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر پتھر نیچے پھینک دیا۔

آہ...... وہ منحوس لمحہ جب اس امریکی نے پتھر نیچے پھینکا، مجھے ساری زندگی یاد رہے گا، کیوں کہ ہوا کے زور سے وہ وزنی پتھر تیزی سے نیچے گیا اور بلی کے معصوم بچے کے سر پر جا لگا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا ننھا سا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل آیا چند سیکنڈ تک تڑپنے کے بعد وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

اب ہم تینوں آنکھیں پھاڑے بلی کے بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو چند ثانیے پیشتر جوانی، زندگی اور حسن کی بہترین تصویر تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس غیر متوقع حادثے نے میرے جسم کو بھی سرد کر دیا ہے ایک لمحے کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بیکار ہو گئیں۔ یہی حال میری بیوی اور امریکی نوجوان کا تھا۔ بلکہ میری بیوی کا تو خوف کے مارے چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔

پتھر گرتے ہی سیاہ بلی نے سر اٹھا کر ہماری جانب دیکھا۔ خدا کی پناہ.... اسکی بڑی بڑی سبز آنکھیں یک دم انگاروں کے مانند سرخ ہو گئیں اور اس کا چہرہ بھیانک انداز

میں کھل گیا۔ اس نے اپنی شعلہ بار نگاہیں ہوجیبین پر جمادیں۔ میرے بدن میں دہشت سے تھرتھری سی چھوٹ گئی اور میری بیوی تقریباً غش کھا کر گر پڑی۔ سیاہ بلّی نے پلٹ کر اپنے تڑپتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا جو جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سر پر سے سرخ سرخ خون کی نکلتی ہوئی پتلی سی دھار نے اس کا سارا جسم لت پت کر دیا تھا۔ بلی کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نہایت محبت سے اپنے مرے ہوئے بچے کا جسم چاٹنے لگی۔ اس کا جبڑا اپنے بچے کے تازہ خون میں بھر گیا اور جب اس نے منہ کھولا تو اس کے لمبے سفید چمکتے ہوئے دانت دیکھ کر میرا کلیجہ بھی حلق میں آ گیا۔ اس کے لمبے لمبے نوکیلے ناخن بھی پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور اس وقت وہ جوش اور انتقام کا ایسا نمونہ بن گئی تھی کہ بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ چند لمحے تک وہ نہایت غیظ آلود اور نفرت انگیز نظروں سے امریکی کو تکتی رہی اور پھر پوری قوت سے دوڑتی ہوئی آئی اور قلعے کی پتھریلی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی اس کے حلق سے اب غراہٹوں اور چیخوں کی دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔

بلّی کا یہ غیظ و غضب اور جوش کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ امریکی نوجوان کی بوٹیاں اڑا دے گی، اس کی خوفناک شکل اور غرانے چیخنے اور سپید دانت دکھانے کا انداز اتنا ڈراونا تھا کہ میری بیوی اسے برداشت نہ کر سکی اسے ہوش میں لانا میرے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ بلی بار بار دوڑتی ہوئی آتی اور قلعے کی سنگین اور بغیر ہموار دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی، مگر ہر مرتبہ پیٹھ کے بل نیچے گر جاتی، تاہم اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا ہی جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو کر نیچے گری، تو اپنے مرے ہوئے بچّے پر جا پڑی اور بلی کا سارا جسم خون میں لت پت ہو گیا، امریکی وہیں کھڑا بلی کی ان حرکات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لئے یہ بھی ایک پر لطف تماشا تھا، میں جلدی سے اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹا کر ذرا فاصلے پر ایک جگہ سائے میں لے گیا اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد ایملیا ہوش میں آ گئی، لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے آثار نمایاں تھے۔

ایملیا کو وہیں چھوڑ کر جیب میں دوبارہ دیوار کے قریب گیا، تو ہوجلبین نے کہا۔

"میں نے دنیا میں ایک سے ایک خوفناک درندے دیکھے ہیں مگر جس وحشی پن کا مظاہرہ سیاہ بلی کر رہی ہے، یہ میرا پہلا مشاہدہ ہے اس کا غصہ ہر لمحہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اسی طرح کا ایک قصہ بیان کرنے لگا جسے میں نے ڈھنگ سے نہیں سنا کیوں کہ میں بلی کی عجیب و غریب حرکات دیکھنے میں لگا ہوا تھا، اس نے پندرہ یا بیس مرتبہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی اور ایک بار تو وہ کافی اوپر آگئی تھی کہ پیر پھسل جانے کے باعث دھڑام سے نیچے جاگری۔ یقیناً اسے سخت چوٹ لگی ہوگی لیکن بلی نے اس چوٹ کی کوئی پروانہ کی اور نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ دوڑتی ہوئی آئی اور دیوار پر چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر امریکی کہنے لگا

"اس جانور کی ہمت پر آفرین ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار پر چڑھ کر ہی دم لے گی۔ مگر افسوس کہ وہ یہاں کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جائے گا، تو وہ اس حادثے کو بھول جائے گی — افسوس ...... صد افسوس ...... مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ پتھر اسکے بچے کو لگ جائے گا۔ یہ حادثہ بالکل اتفاقیہ ہوا ہے۔ ورنہ میری نیت اسے ہلاک کرنے کی نہ تھی... اب جو ہونا تھا ہوگیا....... اب اس بچے میں دوبارہ جان نہیں ڈال جا سکتی۔"

اتنا کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اور اسکے پیچھے ہٹتے ہی بلی نے بھی دیوار پر چڑھنے کی کوشش ترک کر دی اور وہیں بیٹھ کر غضب ناک نظروں سے اوپر دیکھنے لگی۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "کرنل، مجھے افسوس ہے کہ اس حادثے نے آپ کو ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا آہ ..... میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی بیوی نے تو اس کا بہت ہی زیادہ ناگوار اثر قبول کیا ہے۔ مجھے ان سے معذرت کرنی چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ اس جگہ گیا جہاں میری بیوی آرام سے لیٹی تھی۔

مادام .... کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گی ..... یقین کیجئے، اس میں میری کوئی خطا نہ تھی۔ بلی کے بچے کی قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا تھا۔ اب جو ہونا تھا ہوگیا.... اسے فراموش کر دیجئے، اور آئیے، قلعے کی باقی چیزیں دیکھ کر ہم جلد از جلد اس منحوس مقام سے رخصت ہوں۔

ہم تینوں ادھر سے گزرتے ہوئے جب فصیل کے قریب آئے تو غیر ارادی طور پر ہم نے نیچے جھانکا، سیاہ بلی اسی طرح بیٹھی اوپر دیکھ رہی تھی۔ جونہی امریکی کا چہرہ اسے نظر

آیا اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی اس کے دونوں پنجے اس انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے جیسے وہ امریکی کا منہ نوچ لینا چاہتی ہے۔ مگر وہ حسبِ معمول پھر نیچے جا پڑی۔ ساٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا بلاشبہ بلی کے لئے ایک ناممکن بات تھی امریکی نے اب خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلّی کو مخاطب کیا۔

" پیاری بلی۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میں نے جان بوجھ کر تمھارے بچّے کو نہیں مارا میں تو دراصل تمھارا کھیل اور دلچسپ بنانا چاہتا تھا۔۔۔ اب یہ اتفاق تھا کہ پتھر تمہارے بچے کو جا لگا اور وہ مر گیا بخدا اس میں میرا ذرہ برابر بھی قصور نہیں۔ اب تم دیوار پر چڑھنے کی کوشش چھوڑ کر بچے کے کفن دفن کا بندوبست کرو۔ جاؤ شاباش۔۔۔۔"

امیلیا ایک بار پھر بلی کو دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگی اور اس نے نوجوان سے کہا:
ہوجیین، تم اسے مذاق نہ سمجھو۔ بلی کا ارادہ فاسد ہے۔ وہ اگر یہاں ہوتی تو تمھیں ضرور مار ڈالتی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تمھارے لئے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں سلگتی دکھائی دے رہی ہیں۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا۔

مادام آپ مجھے۔۔۔ شیر دل ہوجیین کو۔۔۔۔۔ اس حقیر سیاہ بلی سے ڈراتی ہیں جس نے نہ جانے کتنے درندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یہ بلی میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ میں اب چاہوں تو نیچے جا کر آپ کے سامنے اس کا گلا گھونٹ دوں۔"

بلی نے ہوجیین کا قہقہہ سنا، تو اس میں دفعتہ ایک عجیب تغیر رونما ہوا اس کا سارا جوش اور غضب یک لخت ختم ہو گیا اور وہ پر سکون دکھائی دینے لگی اس نے پھر ہوجیین کی طرف ایک بار دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس طرف گئی جہاں اس کا بچّہ مرا پڑا تھا اور پھر زبان نکال کر بچے کا جسم چاٹنے لگی۔

واقعی بلی اب تمھیں دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ دراصل اس نے تمہاری آواز سن کر اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ شخص تو بہت بڑی بلا ہے اس سے نبٹنا آسان کام نہیں۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا امیلیا بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑی اور ہم تینوں وہاں سے آگے بڑھے تھوڑی دور جانے کے بعد جب ہم نے نیچے جھانکا تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سیاہ بلی اسی جانب چلی جا رہی

تھی جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس نے منہ میں اپنے مردہ بچے کو دبا رکھا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد جب ہم نے دیکھا تو مردہ بچّہ اس کے منہ میں نہ تھا۔ بلّی نے شاید اسے کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ اسے پراسرار انداز میں تعاقب کرتے دیکھ کر امیلیا پر پھر خوف طاری ہوگیا اور اس نے امریکی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی مگر وہ بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا۔

مادام آپ کو اس بلّی سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر وہ ہمارے پیچھے آتی ہے، تو آنے دیجیے۔ بھلا وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ اور فرض کیجیے اگر اس کا ارادہ مجھے نقصان پہنچانے کا ہے تو میں ابھی آپ کے سامنے اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا پستول نکالنا چاہا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ایک بلّی کو مارنے کے جرم میں چند منٹ کے لئے پولیس مجھے پکڑ لے گی۔ وہ مجھے پھانسی دینے سے تو رہے!"

امیلیا نے اسے پستول نکالنے سے روکا ورنہ وہ ضرور بلّی پر گولی چلا دیتا۔

ہوچیین نے ایک بار پھر نیچے جھانک کر دیکھا تو بلّی اسے دیکھ کر غرائی اور پھر جلدی سے ایک پتھر کی آڑ میں ہوگئی۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کیا بلّی کو ہوچیین کے مہلک ارادہ کا پتہ چل گیا تھا؟ بلّی کے یوں دبک جانے پر ہوچین نے فخریہ انداز میں امیلیا کی جانب دیکھا اور کہا "دیکھا مادام نے؟ یہ شریر بلّی اب مجھ سے ڈرنے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے اب یہاں سے لوٹ کر اپنے مردہ بچّے کی حفاظت کرنی چاہیئے، کہیں دوسری بلّیاں اسے ہڑپ نہ کرلیں۔ جاؤ خالہ بلّی، یہاں سے ٹل جاؤ، ورنہ میرا پستول خوامخواہ چل جائے گا۔

امیلیا نے جلدی سے ہوچیین کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹ کر آگے لے گئی لیکن جاتے جاتے بھی امریکی نوجوان نے پیچھے جھانک کر بلّی سے چند مزاحیہ فقرے کہہ ہی لیے۔

"اچھا، الوداع خالہ بلّی..... میں تم سے معذرت کرچکا ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر تمھارے بچّے کو نہیں مارا۔ مگر تم ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ بہرحال تم اب اس حادثے کو فوراً ہی فراموش کردو۔

جلد ہی ہم قلعے کی اندرونی دلچسپیوں اور عجائبات کو دیکھنے میں اس قدر محو ہوگئے کہ تھوڑی دیر پہلے جس ناخوشگوار حادثے نے ہمیں مکدّر کر دیا، اس کی یاد بھی باقی نہ

رہی۔ پھرتے پھراتے آخر کار ہم قلعے کی سب سے زیادہ مشہور اور ہیبت ناک جگہ پہ پہونچ ہی گئے، جہاں ۹ سو سال پیشتر مجرموں اور جاسوسوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

اس وسیع وعریض کمرے کے عمر رسیدہ چوکیدار نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خاصا خوش نظر آتا تھا، کیوں کہ اس روز وہاں کی سیر کرنے والے ہم تین ہی افراد تھے اور چوں کہ چوکیدار کی بالائی آمدنی کا ذریعہ سیاحوں کی دی ہوئی بخشش ہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ضرورت سے زیادہ ہماری جانب توجہ دے رہا تھا۔ وہ عرصۂ دراز سے اس کمرے کا چوکیدار تھا اور یہاں رکھی ہوئی ہر شے کے متعلق اس کی معلومات حیران کن تھیں

جب ہم اس کے اندر داخل ہوئے تو ماحول کی تاریکی اور اس میں رکھی ہوئی عجیب اور پُر اسرار مشینوں اور ہتھیاروں نے ہمارے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا۔ یہ گنبد نما کمرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اُوپر کے حصّے میں جانے کے لئے چند سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہم نے پہلے نچلے کمرے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں دن کے وقت بھی ملگجا سا اندھیرا تھا اس کی دیواریں بہت چوڑی اور موٹی تھیں کمرے میں اوپر کی جانب کوئی روشندان نہ ہونے کے باعث روشنی اور ہوا آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور جا بجا مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تن رکھے تھے جنھیں صاف کرنے کا خیال شاید منتظمین کو کبھی نہ آیا ہم نے جب غور سے دیواروں کا معائنہ کیا تو ان پر بڑے بڑے دھبّے بھی دکھائی دیئے بوڑھے چوکیدار نے بتایا یہ دھبے صدیوں پرانے ہیں اور یہ خون ان لوگوں کا ہے جن کو کسی جرم یا جاسوسی کے شک میں یہاں لا کر اذیتیں دی جاتی تھیں۔ چند ہی لمحے بعد ہمیں احساس ہونے لگا کہ اس بھیانک کمرے کی دیواریں زندہ ہو رہی ہیں اور ان کے اندر سے ہمیں ان بدنصیب لوگوں کے چیخنے اور کراہنے کی آواز سنائی دے رہی ہیں۔ امیلیا کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے ماحول سے ڈر رہی ہے۔ لیکن میری خاطر وہ بظاہر بڑی دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے آدمیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم داستانیں ان خونیں دیواروں میں پوشیدہ تھیں۔

ہم بہت گھبرا کر اس وحشت ناک جگہ سے نکل آئے۔ چوکیدار اب ہمیں اُوپر کی سیڑھیوں کے ذریعہ دوسرے کمرے میں لے جا رہا تھا۔

جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، دہشت کی ایک نئی لہر ہمارے جسموں میں دوڑ گئی۔ امیلیا نے میرا بازو سختی سے تھام لیا۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور خود میرا یہ حال تھا کہ اپنے دل کی دھڑکنے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ اس کمرے کا ماحول نچلے کمرے کے ماحول سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک تھا۔ اس کی ہر شے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہی تھی اور ہم نے ان اذیت دینے والی مشینوں اور دیواروں پر لگے ہوئے سینکڑوں قسم کے ہتھیاروں کے قہقہوں کی آوازیں بھی سنیں۔

بوڑھے چوکیدار نے فوراً محسوس کر لیا کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے ایک موم بتی جلائی، جس کی مدھم کانپتی ہوئی روشنی وسیع و عریض کمرے میں پھیل گئی، اب ہم آسانی سے یہاں رکھی ہوئی چیزوں کو پہچان سکتے تھے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی تلواریں، کلہاڑے، نیزے اور خنجر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر تلواریں اور کلہاڑیاں اتنی بڑی اور وزنی تھیں جنھیں اٹھانا عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ غالباً ان گرانڈیل جبشی جلادوں کے استعمال میں آتی تھیں جنھیں خاص طور پر مجرموں کی گردن مارنے کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ ان ہتھیاروں کے قریب ہی پرانی سیاہ لکڑیوں کے بہت بڑے بڑے کندے بھی پڑے دکھائی دیے، جن پر جا بجا کسی روغن کے دھبے جمے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ لکڑی کے یہ وہ کندے ہیں جن پر مجرموں کو لٹا کر ان کی گردن کاٹی جاتی تھی۔ ہم نے جھک کر کندوں پر تلواروں کے گہرے نشان بھی دیکھے۔ کمرے کے ایک حصے میں وہ تمام چھوٹی بڑی مشینیں بکھری تھیں، جو مجرموں اور جاسوسوں کو اذیت پہنچانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہوتی تھی۔ یہاں ہم نے ایک کرسی دیکھی جس کی نشست پر لوہے کی لمبی لمبی اور نہایت تیز نکیلی سلاخیں لگی تھیں۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ یہ موت کی کرسی ہے۔ اس پر مجرم کو بٹھا دیا جاتا تھا اور یہ سلاخیں اس کے گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ ایسا مجرم کئی کئی روز جان کنی کی حالت میں مبتلا رہنے کے بعد مرتا۔

اس کرسی کے علاوہ متعدد قسم کے شکنجے بھی موجود تھے جن میں انسانی جسم کو اس طرح جکڑا جا سکتا تھا کہ ذرا بھی جنبش نہ کر سکے۔ لوہے کی چھوٹی بڑی بیڑیاں، لوہے کے جوتے، سر اور گردن کو جکڑنے والے شکنجے اور آہنی خول جو بھیجے کو کھوپڑی سے باہر نکال سکتے تھے۔ مگر

میں گھومتے ہوئے ہم ایک بڑی سی آہنی مشین کے قریب پہنچے جس کی عجیب وغریب ساخت نے امریکی نوجوان کو بہت متاثر کیا۔ یہ مشین ایک عورت کے مجسمے سے مشابہ تھی۔ اور اس میں جابجا زنگ لگا ہوا تھا۔ اس کے عین وسط میں کچھ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ ایک بڑا سا آہنی کڑا تھا جس میں موٹا سا رسّا بندھا ہوا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ اس مشین کو "آئرن ورجن" کہتے ہیں اور اذیت دے کر ہلاک کرنے کے لئے اس مشین سے زیادہ بہتر اور کوئی مشین نہیں۔ آپ اسے غور سے دیکھئے یہ برسوں تک خون میں نہا چکی ہے اور اب بھی اس کے ایک ایک حصّے پر خون کی جمی ہوئی تہہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔

چوکیدار نے ستون سے بندھا ہوا موٹا رسا کھولا اور پوری قوت سے اُسے کھینچنے لگا۔ اب ہم نے حیرت سے دیکھا کہ مشین کے اوپر بنا ہوا ایک چھوٹا سا دروازہ گڑگڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ اُوپر اٹھنے لگا۔ یہ آہنی دروازہ بہت بھاری تھا، کیوں کہ اسے کھینچتے ہوئے بوڑھا چوکیدار جلد ہی ہانپنے لگا۔ تاہم اس نے دروازہ پوری طرح اوپر اٹھادیا جس پر بہت سی نوکدار سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہمیں مشین کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ آہنی دروازہ اٹھنے کے بعد مشین کے اندر اتنی جگہ تھی جس میں ایک آدمی آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا: "اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مشین کس کام آتی تھی۔ ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس مشین کے اندر خالی جگہ میں لٹا دیا جاتا تھا اور لوہے کے اس سلاخ دار دروازے کو آہستہ آہستہ نیچے گرایا جاتا۔ بدنصیب قیدی جب ان خون آشام سلاخوں کو اپنی آنکھوں اور جسم کی طرف بڑھتے دیکھتا، تو موت کے لرزہ خیز خوف سے جرم کا اقبال کر لیتا اور سارے راز اگل دیتا لیکن بعض ایسے مجرم بھی ہوتے جو اس حالت میں بھی زبان نہ کھولتے، تو رسّے کو فوراً چھوڑ دیا جاتا۔ اور یہ آہنی دروازہ پوری قوت سے نیچے گر جاتا اور وہ آناً فاناً موت سے ہمکنار ہو جاتا۔"

امیلیا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔ "خدا کے واسطے مجھے اس منحوس جگہ سے فوراً لے چلو۔ میں یہاں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ ورنہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔" میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ ہم تو صرف یہاں کے عجائبات دیکھنے آئے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔ وہ کیا خیال کرے گا۔ میں اسے سمجھا بجھا کر جب واپس کمرے میں لایا تو امریکی نوجوان اس مشین کے

پاس کھڑا تھا اور اس کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ بولا۔

"آپ کی بیوی بہت کمزور دل کی خاتون ہیں۔ بلاشبہ انھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کی غیر حاضری میں اس مشین کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں چوکیدار سے معلوم کی ہیں۔ میں نے اپنے ملک کے ریڈ انڈین باشندوں کے متعلق بڑی بڑی داستانیں سنی تھیں کہ وہ اپنے دشمنوں اور حریفوں کو عجیب عجیب سزائیں دیتے تھے، مگر یہ مشین بے مثال ہے۔ خدا کی پناہ مجھے تو اس کے تصور ہی سے اذیت ہوتی ہے۔ لیکن ..... میں اپنا تجربہ مکمل کر کے ہی واپس جاؤں گا۔"

کیا کہتے ہو، کیسا تجربہ؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

یہی معمولی سا تجربہ۔ میں خود ایک منٹ کے لئے اس مشین کے اندر لیٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوہے کا یہ سلاخ دار دروازہ کس طرح آہستہ آہستہ نیچے آتا ہے۔

"نہیں نہیں۔" املیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ خدا کے لئے، ہوچین ایسا نہ کرنا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟

"آپ جو چاہیں سمجھیں، مگر میں یہ تجربہ کر کے رہوں گا،" ہوچین نے اصرار کیا۔ "آپ ڈرتی ہیں تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر چہل قدمی کیجئے۔ میں آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں۔ نہ جانے اب تک کیسے کیسے واقعات و حادثات مجھ پر بیت چکے ہیں۔ آپ یقین کیجئے، ایک مرتبہ مونٹانا کے جنگل سے میں گزر رہا تھا کہ دشمنوں نے مجھے مار ڈالنے کے لئے جنگل میں آگ لگا دی میں رات بھر ایک مرے ہوئے گھوڑے کے اندر چھپا رہا۔ تب جان بچی۔ اسی طرح نیو میکسیکو میں مجھے سونے کی ایک کان میں جو حادثہ پیش آیا، وہ بڑا خوفناک تھا۔ دو روز تک میں ایک غار میں قید رہا جس کے دروازے پر ایک بڑا پتھر آن گرا تھا۔ غور کیجئے، جب ایسے ایسے عظیم حادثوں سے میں بچ گیا، تو اس دو منٹ کے تجربے سے کیا قیامت برپا ہو جائے گی؟"

میں نے دیکھا کہ وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے اور یہ کام ضرور کر گزرے گا تو کہا:

اچھا... اچھا.... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو... ہم اب یہاں زیادہ دیر

نہیں ٹھہر سکتے۔ میری بیوی کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔"

امریکی نے مسخرے پن سے مجھے سیلوٹ کیا اور کہنے لگا۔

"جو حکم جناب کا...... بس ابھی فارغ ہوا جاتا ہوں...."

پھر وہ چوکیدار سے مخاطب ہوا جو امریکی نوجوان کے اس خطرناک تجربے میں مدد دینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

"بڑے میاں تم بھی ڈر گئے۔ یہ لو اپنی جیب گرم کرو۔" ہوجیبین نے سونے کا ایک سکہ بوڑھے کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔ "اب ایک کرو ایک رسی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس مشین میں مجھے لٹا دو تاکہ میں اس تجربے کا وہی مزا پا سکوں جو پرانے زمانے کے مجرموں کو ملتا تھا۔

بوڑھے چوکیدار کو پہلی مرتبہ اس معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"جناب، آپ یہ حرکت نہ کریں.... اس میں جان کا خطرہ ہے۔ فرض کیجئے اگر رسا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو....."

امریکی نے جوش میں آکر کہا۔ "بڑے میاں، تمھیں زیادہ دیر تک رسا پکڑنا نہیں پڑے گا۔ بس ایک یا دو منٹ کا کام ہے اسکے بعد میرا دوست مجھے مشین سے باہر نکال لے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اس تجربے کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے کہو تو تحریر لکھ کر دے دوں۔

اچھا صاحب جس طرح آپ کہتے ہیں، کرتا ہوں۔ مگر براہ کرم باہر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا۔ ورنہ میری ملازمت جاتی رہے گی۔ روزی کا معاملہ ہے صاحب۔

"اجی تم پروا نہ کرو.... ذرا جلدی سے رسی تلاش کر لاؤ۔

چوکیدار باہر گیا اور پتلی رسی کے دو لمبے لمبے ٹکڑے لے کر آیا اور پہلے اس نے ہوجیبین کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیئے اور پیر باندھنے والا تھا کہ ہوجیبین نے کہا۔

بڑے میاں، ذرا ٹھہرو۔ تمہاری دعا سے میں کافی صحت مند آدمی ہوں۔ تم مجھے اٹھا کر اس مشین کے اندر لٹا نہیں سکو گے اس لئے میں خود اس میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بعد ازاں تم میرے پیر بھی باندھ دینا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مشین کے اندر داخل ہو کر اس اطمینان سے لیٹ گیا۔ جیسے کسی آرام دہ بستر پر سونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چوکیدار نے دونوں ٹانگیں باندھ دیں ہوجیبین

اب موت کی اس مشین میں بالکل بے بس پڑا تھا۔ لیکن خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے پر ظاہر نہ ہوئی۔ بلکہ وہ بچوں کی طرح اس کارنامے پر خوش ہو رہا تھا۔

" واہ واہ کیا شاندار جگہ ہے..... بھئی میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس مشین کو اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں۔ بڑی آرام دہ چیز ہے اچھا بڑے میاں، اب تم اس آہنی دروازے کو ذرا ڈھیل دے کر آہستہ آہستہ نیچے اتارو۔ میں دیکھوں تو سہی کہ جب یہ سلاخیں میری جانب بڑھیں گی، تو کیا مزا آتا ہے۔"

" اوہ .... خدا رحم کرے ..... ہوجینن، کیا تم اس بے ہودہ مذاق سے باز نہیں آسکتے ؟" میری بیوی چلا اٹھی۔ " بس اب کافی ہے.... تمہارا تجربہ مکمل ہوگیا۔ اب باہر آجاؤ۔"

ہوجینن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: کرنل صاحب، مہربانی کرکے اپنی ڈرپوک بیگم کو ذرا گھمانے لے جایئے۔ غضب خدا کا میں آٹھ ہزار میل کا سفر طے کرکے محض اس مشین کی خاطر آیا ہوں اور اب اسکے اصل تجربے سے محروم ہی چلا جاؤں ؛ ہرگز نہیں ہوسکتا... آپ پانچ دس منٹ ان کو سیر کرایئے۔ اتنی دیر میں یہ تجربہ پورا ہو چکے گا۔ پھر ہم اسے یاد کرکے خوب ہنسیں گے۔

املیا کی حالت اگرچہ ابتر ہو رہی تھی۔ مگر وہ کمرے سے باہر جانے پر تیار نہ تھی۔ وہ خاموشی سے میرا بازو پکڑے ہوجینن کی طرف تکتی رہی بوڑھا چوکیدار آہستہ آہستہ، ایک انچ کرکے رسا چھوڑنے لگا اور آہنی دروازہ مشین کی طرف جھکتا گیا۔ ہوجینن کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہوگیا۔ اسکی آنکھیں لمبی نوک دار سلاخوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک وہ کہنے لگا۔

"کرنل سچ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں اتنا لطف میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھایا۔ بخدا تم بھی اس تجربے کو آزما دیکھو۔ اے بڑے میاں، ذرا آہستہ تم تو ایک دم رسا چھوڑ دینے پر تلے ہوئے ہو۔"

بوڑھے چوکیدار نے رسا پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ اسکی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ منٹ کے قلیل عرصے میں آہنی دروازہ صرف تین انچ کے قریب جھک سکا تھا۔ دفعتہً میں نے اپنے بازو پر ایک تھرتھراہٹ محسوس کی۔ املیا کی

کی گرفت نرم پڑ رہی تھی۔ میں نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکے چہرے کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ سپید پڑ گئے تھے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر مشین کے ایک جانب گھور رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دہشت سے میری رگوں کا خون جم گیا۔ خدا کی پناہ .... وہی منحوس کالی بلی کمرے کے دروازے میں کھڑی مشین کی جانب دیکھ کر غرا رہی تھی۔ اسکی زرد آنکھیں مشعل کی مانند روشن تھیں۔ اسکے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا۔ وہ اپنی معمولی جسامت سے دوگنی نظر آتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا خون آلود جبڑا کھول کر آگے بڑھی۔ ہوجیین نے بھی اسکی آواز سن لی تھی، وہ وہیں سے چلایا۔

کرنل، ذرا اس شریر بلی کو دھتکار کر نکال دو۔"

لیکن .... آہ ..... اس سے بیشتر کہ میں آگے بڑھتا۔ بلی نے اپنی دم کو گردش دی۔ اور بجلی کے مانند اچھل کر بوڑھے چوکیدار پر حملہ کیا۔ بلی کا دایاں پنجہ چوکیدار کی آنکھ پر پڑا اور آنکھ باہر آ گئی۔ بوڑھے کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور موٹا رسہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے رسے کو پکڑنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ میری انگلیوں نے اسے چھو لیا۔ مگر اگلے ہی ثانئے میں رسا کڑے میں سے گزر چکا تھا۔ بدنصیب ہوجیین کے چہرے کی آخری جھلک میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا۔ موت کے خوف سے اسکا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور آنکھیں تارہ بن گئی تھیں۔ آہنی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ ہوجیین کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور اسی لمحے میری بیوی غش کھا کر دھڑام سے فرش
میں نے امیلیا کو وہاں سے اٹھایا اور کمرے سے باہر برآمدے میں لے جا کر ایک بنچ پر ڈال دیا۔ اس وقت میرے ہوش و حواس بھی گم تھے۔ امریکی نوجوان کی بھیانک موت کا تصور خود میرے لئے جان لیوا تھا۔ جب میں گیا تو بوڑھا چوکیدار تکلیف کی شدت سے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑا خون میں تر ہو چکا تھا۔ میں نے رسا پکڑ کر پوری قوت سے مشین کا آہنی دروازہ اٹھایا۔ ہوجیین کا حال دیکھ کر میری روح لرز گئی۔ لوہے کی سلاخیں اسکی کھوپڑی، سینے اور پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل گئی تھیں۔
دروازہ اوپر اٹھتے ہی ہوجیین کا مردہ اور مسخ شدہ جسم پُرشور آواز کے ساتھ کمرے کے فرش پر گرا اور وہ منحوس سیاہ بلی جو ابھی تک موجود تھی، اس کی جانب لپکی اور ہوجیین کے جسم سے نکلے ہوئے خون کو بڑی رغبت سے چاٹنے لگی۔ میں نے جھپٹ کر وہاں رکھی ہوئی تلواروں میں سے ایک تلوار اٹھائی اور بلی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

KARKHANA DARUSSEHAT
KDS
REGISTERED
QUDRATI
TEL
قدرتی تیل
INDICATIONS
PAIN IN JOINTS AND
MUSCLES, SPRAIN,
SWELLING, CUTS & BURNS
TRADE MARK
ESTD. 1903
DARUSSEHAT (REGD.)
MAUNATH BHANJAN U.P.
جہاں گیا چھا گیا
درد ، زخم ، چوٹ
موچ ، کٹنے اور
جلنے پر
مفید
ہے
قدرتی تیل
قائم شدہ ۱۹۰۳ء
کارخانہ دارالصحت مئوناتھ بھنجن، یوپی

FASANA (URDU MONTHLY) VOL. I—IV
ALLAHABAD. Price ·75 P. Regd. No. L— 420
Registered with the Registrar of Newspapers for India at No. 9775/64

Cover : Bhargava Press, Alld.